شعبان المعظم۔شوال المکرم ۱۴۴۰ھ
اپریل۔جون ۲۰۱۹ء

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

مؤسّس: ڈاکٹر اسرار احمد
مرکزی انجمن خُدّامُ القرآن لاہور

رمضان المبارک کا خصوصی تحفہ

مُنتخَباتِ
بیانُ القرآن

از

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

قرآنی مضامین کے گلہائے رنگا رنگ
پر مشتمل ایک خوبصورت گل دستہ

- امپورٹڈ آفسٹ پیپر
- معیاری طباعت
- مضبوط جلد
- صفحات: 437
- قیمت: 800 روپے

یہ کتاب رمضان المبارک میں خصوصی رعایتی قیمت پر دستیاب ہوگی

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501 (042)

Email:maktaba@tanzeem.org

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا
(البقرۃ: ۲۶۹)

سہ ماہی حکمت قرآن لاہور

جلد ۳۸ شمارہ ۲

شعبان المعظم۔شوال المکرم ۱۴۴۰ھ اپریل۔جون ۲۰۱۹ء

بیاد:

ڈاکٹر محمد رفیع الدین ــ ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہما

مدیر مسئول: ڈاکٹر ابصار احمد

مُدیر : حافظ عاطف وحید

نائب مُدیر:
حافظ خالد محمود خضر

ادارۂ تحریر:
ڈاکٹر حافظ محمد زبیر۔ مؤمن محمود
پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

یکے از مطبوعات
مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور۔فون 3-35869501
ویب سائٹ : www.tanzeem.org
ای میل: publications@tanzeem.org
سالانہ زرِتعاون : 280 روپے ، فی شمارہ :70 روپے

اِس شمارے میں

حرفِ اوّل

تہذیبِ حاضر کے گرفتار!	ڈاکٹر ابصار احمد	3

حکمتِ نبویؐ

نبی رحمت ﷺ کی بددعا	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	10

تذکّر و تدبّر

مِلاکُ التأویل (۱۷)	ابوجعفر احمد بن ابراہیم الغرناطی	13

فہمُ القرآن

ترجمۂ قرآن مجید، مع صرفی ونحوی تشریح	افاداتِ حافظ احمد یارؒ	27

حُسنِ معاشرت

بیوی کے حقوق	پروفیسر حافظ قاسم رضوان	43

حکمتِ دین

''حجۃ اللہ البالغہ'' ایک عظیم کتاب	ارسلان اللہ خان	56

فکر و نظر

یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ (۲)	پروفیسر حافظ احمد یارؒ	61

کتاب نُما

تعارف وتبصرہ	پروفیسر محمد یونس جنجوعہ	79

بیانُ القرآن

MESSAGE OF THE QURAN	Dr. Israr Ahmad	96

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تہذیبِ حاضر کے گرفتار!

اس تحریر کا عنوان علامہ اقبالؒ کے ایک شعر سے لیا گیا ہے جو یہ ہے: ؎

سن اے تہذیبِ حاضر کے گرفتار
غلامی سے بتر ہے بے یقینی!

عصرِ حاضر میں عالَمِ اسلام کی بیشتر ''مسلم'' آبادی جس طرح مادہ پرستانہ اور بے خدا تہذیب و کلچر کے نرغے میں ہے اور جس وسیع الجہات بے یقینی، حیرانی اور سرگردانی کی کیفیت سے دوچار ہے، اس کے مظاہر ہر صاحبِ فکر و نظر کو اپنے اردگرد ماحول میں بکثرت نظر آ جائیں گے۔ اور یقیناً یہ صورت حال ایک صاحبِ ایمان کو آزردہ اور دکھی کر دینے والی ہے۔ اسلامی معتقدات سے لاعلمی اور شعائرِ اسلامی کی ناواقفیت اور کھلی توہین نہ صرف عوام کی سطح پر پائی جاتی ہے بلکہ تعلیم یافتہ اور خواص میں بھی قرآن و سُنّت کے مخالف رویے اور سوچ دیکھنے اور پڑھنے میں آتی ہے۔ ہمارے اعلیٰ تعلیمی اداروں اور یونیورسٹیوں میں مغربی فکر و تہذیب اور زاویہ نگاہ کا استیلاء اتنا گہرا اور ہمہ گیر ہے کہ الامان والحفیظ۔ جامعات سے فارغ التحصیل حضرات کی بڑی تعداد سائنس زدہ اور مغرب آلودہ ذہن رکھتی ہے۔ اور المیہ یہ ہے کہ انہی لوگوں کے ہاتھ میں وطنِ عزیز کی سیادت و قیادت ہے اور تمام شعبوں میں پالیسی سازی کے تمام اختیارات انہی کے پاس ہیں۔

چند ہفتوں قبل گلبرگ (لاہور) کے ایک مشہور بزنس ایڈمنسٹریشن کالج کی تقریب میں بطور مہمانِ اعزاز جانے کا اتفاق ہوا جہاں چیف گیسٹ کی حیثیت سے سابق چیف جسٹس (سپریم کورٹ آف پاکستان) جناب ثاقب نثار صاحب تشریف لائے تھے۔ راقم نے گفتگو کے لیے ذہن بنانے کے لیے جسٹس صاحب کی کچھ دن قبل لاہور لٹریچر فیسٹیول میں کی گئی تقریر یوٹیوب کی مدد سے سنی تاکہ پاکستان میں آبپاشی، زراعت اور پانی کے حوالے سے ان کے خیالات اور مساعی سے تفصیلی واقفیت حاصل ہو سکے۔ سابق چیف جسٹس چونکہ قانون کے میدان کے ایکسپرٹ ہیں اس لیے انہوں نے پانی کی اہمیت اور انسانی حیات کے لیے اس کی اشد ضرورت کی وضاحت Right to Life کے حوالے سے کی، یعنی اسے ہیومن رائٹس ڈسکورس کا ایک اہم نکتہ قرار دیا۔ انہوں نے بجا طور پر فرمایا کہ پاکستان پانی کی انتہائی شدید کمی کا خطہ (water-stressed country) ہے اور ہم اس کا کسی درجے میں تدارک جلد از جلد ڈیموں کی تعمیر سے کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے طور پر دیامر اور مہمند ڈیمز کے لیے فنڈز کی فراہمی کی مہم میڈیا کی حمایت کے ساتھ زور شور سے شروع کی اور اس سلسلے میں اپنی اپیل

پورے پاکستان میں اور بیرونِ ملک محبِّ وطن مخیّر حضرات کو پہنچانے کی کوشش کی۔ اس میں قطعاً کوئی شک نہیں ہے کہ صرف انسان ہی نہیں، تمام ذی حیات مخلوق انواع (species) کی زندگی کا دارومدار پانی پر ہے، اس کے بغیر وہ چند دنوں میں موت کے گھاٹ اتر جاتے ہیں۔ چنانچہ اسی لیے جہاں ایک طرف ربِّ کائنات نے پانی کے وسیع ذخائر تمام ذی حیات نفوس کے لیے بہم پہنچائے ہیں، انسانوں کو یہ شعور بھی عطا کیا ہے کہ وہ کس طرح آبی ذخیروں کو محفوظ کر کے اپنی جملہ ضروریات پورا کریں۔ یہ الگ بات ہے کہ بین الاقوامی سطح پر ایک ملک اپنے ہمسائے ملک پر زیادتی کرتے ہوئے اس کے دریاؤں کا پانی بالکل ختم یا انتہائی کم کر دے اور اس طرح اسے اقتصادی مسائل اور اضطراری کیفیات سے دوچار کر دے۔ سابق چیف جسٹس صاحب کا پانی کی اہمیت اور کائنات کی ساخت و ہیئت میں پانی کو ایک بنیادی ترین عنصر سمجھنا بھی درست ہے اور نہ صرف ایک طرف کلام ربانی بشمول قرآن کریم اور دوسری جانب سائنسی فکر بھی پانی کو مبدأ حیات قرار دیتی ہے۔

راقم نے اس سنجیدہ علمی نشست میں سامعین کی توجہ زندگی کے مختلف مدارج اور انواع کی طرف مبذول کروائی۔ زندگی ابتدائی اور نچلی سطح پر صرف متنفس وجود کی بائیولوجیکل حیات ہے اور اس زندگی کی بقا کا انحصار یقیناً پانی، ہوا اور غذائی مادوں کی مناسب مقدار میں فراہمی پر ہے۔ حیات کی یہ صورت ہمیں انتہائی حقیر کیڑوں مکوڑوں سے لے کر انتہائی زیرک جانوروں تک میں نظر آتی ہے جنہیں ہم شہروں میں بنائے گئے Animal Zoo اور بڑے پیمانے پر وسیع و عریض National Parks میں محبوس کر کے سیر و تفریح کا سامان بناتے ہیں۔ دوسری جانب حیات کا ایک اعلیٰ تصور وہ ہے جو ہمیں وحی ربانی سے معلوم ہوتا ہے، جس کے مطابق وہ ایمانیات سے مملو حقیقی نظریاتی حیات ہے۔ چنانچہ سورۃ الانفال کی آیت ۲۴ میں ارشاد ہوا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا يُحْيِيْكُمْ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَحُوْلُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهٖ وَاَنَّهٗٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۲۴﴾

''اے ایمان والو! تم اللہ اور رسول کے کہنے کو بجالاؤ، جب کہ رسول تم کو زندگی بخش چیز کی طرف بلاتے ہیں۔ اور جان رکھو کہ اللہ تعالیٰ آدمی کے اور اُس کے قلب کے درمیان آڑ بن جایا کرتا ہے اور بلاشبہ تم سب کو اللہ کے پاس جمع ہونا ہے۔''

حقیقی حیات اور زندگی کا نسخہ قرآن کریم نے ان تعلیمات کو کہا ہے کہ جن پر عمل کر کے ایک بندۂ مؤمن بامقصد اور اللہ کی مطلوب زندگی گزارتا ہے اور نتیجتاً آخرت میں ابدی انعام و اکرام اور اللہ کی رضا حاصل کرتا ہے۔ مطلب یہ کہ حکم ہے کہ لوگ صرف اللہ اور اُس کے حقیقی نمائندے یعنی رسول اللہ ﷺ کے فرامین مانیں اور ان پر عمل کریں، اسی میں اصل زندگی اور حیاتِ جاوداں ہے۔ اسی بیان کو مؤکّد کرتے ہوئے سورۃ الاعلیٰ (آیات ۱۶، ۱۷) میں انسانی طبعی کمزوری اور شیطان کے حملوں کے مؤثّر ہونے کی وجہ بھی بیان کر دی:

﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۱۶ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۱۷﴾

''لیکن تم دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو' حالانکہ آخرت بہت بہتر اور بقا والی ہے۔''

دنیا اور اس کی ہر چیز اور آرام و آسائش فانی اور عارضی ہے' جب کہ آخرت کی زندگی دائمی اور ابدی ہے۔ اس لیے ہونا تو یہ چاہیے کہ ہر عاقل اور ہوش مند فانی چیز کو باقی رہنے والی پر ترجیح نہ دے۔ راقم نے سابق چیف جسٹس ثاقب نثار صاحب کے Right to Life کے ضمن میں یہ واضح کیا کہ دنیا کے کئی ممالک اور بالخصوص مغربی ممالک میں لوگ Right to death کی بات بھی کرتے ہیں اور اس طرح بہت سے خواتین و حضرات خودکشی کر کے بزعم خویش اپنے آپ کو ختم کر ڈالتے ہیں۔ لیکن قرآن کریم کی تصریحات کے مطابق ہر انسان یہاں کی موت کے بعد عالمِ آخرت میں دوبارہ اٹھایا جائے گا اور ابدی اجر و ثواب یا عذاب و انتہائی کرب کا معاملہ ہوگا۔ دوزخ میں جلنے والے اس آب و گل کی دنیا کے Right to Life کے برعکس آخرت میں Divinely decreed eternal life میں آگ کے شدید ترین عذاب سے دوچار ہوں گے۔ وہ جہنم کے داروغہ سے فریاد کریں گے کہ ہمیں موت آ جائے تاکہ ہم کرب سے نجات پالیں' لیکن وہاں موت نہیں آئے گی اور جہنمی کی ایک کھال جلنے پر دوسری کھال دے کر دائمی طور پر المناک عذاب و اذیت سے گزارا جائے گا۔

چونکہ یہ تقریب ایک اعلیٰ تعلیمی ادارے میں منعقد ہوئی تھی اس لیے پروفیسر حضرات اور بالخصوص طلبہ و طالبات کے سامنے یہ بات بھی بیان کی کہ کس طرح ہمارے ملی شعراء اکبر الٰہ آبادیؒ اور علامہ اقبالؒ نے تقریباً ایک صدی قبل برطانوی سامراج کے زیر اثر برصغیر میں جدید تعلیم کے ذریعے نوجوان نسل کے اسلامی عقائد اور دینی تہذیب سے بیگانہ ہونے کا نوحہ کہا ہے۔ اکبر الٰہ آبادی کے یہ اشعار ہمارے ملک میں تعلیم کی کیفیت اور نتائج کی صحیح ترین عکاسی کرتے ہیں ؎

علومِ مغربی کے بحر میں غوطے لگانے سے
زباں گو تیز ہو جاتی ہے ' دل طاہر نہیں ہوتا

؎ تعلیم جو دی جاتی ہے ہمیں' وہ کیا ہے فقط سرکاری ہے
جو عقل سکھائی جاتی ہے' وہ کیا ہے فقط بازاری ہے!

عصری تعلیم کی فسوں کاری اور نوجوان نسل میں ذہنی مغربیت پیدا ہونے کے حوالے سے علامہ اقبالؒ کے بے شمار اشعار اور منظوم کلام ہے جنہیں طوالت سے بچنے کے لیے بیان نہیں کیا جا رہا۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ ہم ان کے اشعار تو اپنی محفلوں اور علمی و ثقافتی تقریبات میں ترنم سے پڑھتے ہیں لیکن عمل کا بالکل فقدان ہے۔ ہماری یونیورسٹیوں اور اعلیٰ تعلیمی و تحقیقی اداروں کے اکیسویں گریڈ کے پروفیسر حضرات تک اسلامی علمیت کے ذخیرے سے مکمل طور پر نابلد ہیں۔ ان کے افکار اور تحریروں میں بیان کیے گئے اکثر مزعومہ اصول متضاد المعنی (oxymoron) ہوتے ہیں۔ اکثر و بیشتر وہ کوئی علمی بحث و تمحیص یا مکالمہ کرتے دکھائی نہیں دیتے بلکہ خود کلامی

کے انداز میں یک طرفہ نقطہ نظر بیان کرتے ہیں۔ ان کی اکثریت پوسٹ کولونیل مائنڈ سیٹ رکھتے ہوئے واضح طور پر کینیڈین فلسفی چارلس ٹیلر کے الفاظ میں mimic self (استعماری غلامِ نفس) کی تصویر پیش کرتے ہیں۔ اس قبیل کے بہت سے نام نہاد حکماء وفضلاء جدید سیکولر فکر اور سائنسی واقتصادی ترقی کی مصنوعی وسطحی رنگینی، زینت اور چمک دمک سے متاثر ہوکر پورے اذعان سے یہ رائے پیش کرتے ہیں کہ قرآن اور اسلامی تعلیمات نے بھی دنیا کو مزین کرنے اور تعیّشاتِ دُنیا کو انجوائے کرنے کی اجازت دی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کفار کی نظر اور تگ وتاز صرف دنیاوی عیش تک ہوتی ہے اور اس کے برعکس صاحب ایمان لوگوں کے نزدیک —— اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْاٰخِرَۃِ —— کے مطابق اصل اور مستمر عیش وآرام صرف آخرت کی زندگی میں ہے۔ ہمارا مشاہدہ ہے کہ اللہ اور آخرت کا منکر دنیا کو آخرت پر ترجیح دے کر طولِ امل کا شکار رہتا ہے، جس کی حرص وطمع کی آگ کو صرف قبر کی مٹی ہی سرد کرسکتی ہے۔ بفحوائے آیت قرآنی:

﴿اَلْهٰىكُمُ التَّكَاثُرُ ۝۱ حَتّٰى زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ ۝۲﴾ (التکاثر)

''کثرت اور زیادتی کی چاہت نے تمہیں غافل کردیا، یہاں تک کہ تم قبرستان جا پہنچے۔''

﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝۶۴﴾ (العنکبوت)

''اور آخرت کا گھر ہی یقیناً اصل زندگی ہے۔ کاش کہ انہیں معلوم ہوتا!''

احادیث نبویہ اور اسلامی لٹریچر میں زہد، قناعت اور فقر کی اہمیت پر مثبت انداز میں جو روایات آئی ہیں وہ ثابت کرتی ہیں کہ محولہ بالا مادہ پرستانہ اور اقتصادی ترقی وافزائش (Development & Progress) کا فلسفہ ایک سراب اور دجل کے سوا کچھ نہیں، اور کم از کم دیندار لوگوں کی سوچ سے بالکل مناسبت نہیں رکھتا۔

انگلش میڈیم سکولوں اور جدید مغربی افکار سے متاثر تعلیم گاہوں کے فارغ التحصیل قلمکار جس نہج پر اپنے خیالات کا اظہار کررہے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ وہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دین پسند اور دین پر کاربند مسلمانوں کے لیے انتہائی باعث تشویش امر ہے۔ اور المیہ یہ ہے کہ ان ہی حضرات وخواتین کی تحریروں کو ہمارا پرنٹ میڈیا اردو اور انگریزی دونوں قسم کے جرائد واخبارات میں جگہ دیتا ہے۔ اور اس طرح ان کے اثرات بہت ہی گہرے اور وسیع حلقے میں پھیل رہے ہیں۔ معاصر دین مخالف علمی، تہذیبی ومعاشرتی آشوب خوفناک انداز سے بڑھتا چلا جارہا ہے۔ ایک مؤقر انگریزی روزنامہ میں لکھنے والی خاتون جن کا نام ان کے بڑوں نے قرآن کریم میں مستعمل لفظ کی نسبت سے افنان قیوم رکھا، کی فکری مناسبت اسلام کی مابعد الطبیعیات اور ایمانیات سے دور کی بھی نہیں بلکہ عین مخالف اور متضاد ہے۔ محترمہ افنان نظریہ توحید پر مبنی مسلم شخصیت کو مضیق اور انقباضی شخصیت (constricted identity) قرار دیتی ہیں۔ ان کے خیال میں توحید کے عقیدے پر تشکیل پانے والی شخصیت اور فرد لازماً تشدد پسند اور انتہا پسند ہوتا ہے۔ ان کا یہ جملہ از حد قابلِ توجہ اور حقائق کی تردید کرنے والا ہے:

A singular identity breeds violence.

اصل مسئلہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے افکار کے لیے تمام انسپائریشن ایک بنگالی ہندو اکانومسٹ اور دانشور امریتا سین سے لی ہے اور ان کو اپنا علمی وفکری آئیڈیل سمجھتی ہیں۔ پاکستان میں رہتے ہوئے بھی وہ اپنے دینی ماخذ اور مصلحین و علمی زعماء سے بالکل ناواقف ہیں اور امریتا سین سے متاثر ہو کر کسب فیض کرتی ہیں۔ افنان قیوم کے نزدیک مخلوطیت (syncretism) اور تکثیریت (pluralism) کے عناصر پر بننے والی شخصیت زیادہ پسندیدہ اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ سنکریٹزم اور پلورلزم کے الفاظ گزشتہ دو تین دہائیوں سے مغربی افکار اور نگارشات سے متاثر ہمارے دانشور بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ اول الذکر مختلف اجزاء یا اقسام یا تصریفی ضرورتوں بالفاظ دیگر نقیضین کو ملا کر ایک کر دینے کا عمل کہلاتا ہے' اور مؤخر الذکر اکائی اور وحدت کے بجائے متعدد اور کثرت کے لیے ترجیح ہے۔ جبکہ اسلام اپنے نظریہ توحید میں بالکل خالص ویکتا اور کسی آمیزش کو روا نہ رکھنے والا ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ :

باطل دوئی پسند ہے' حق لا شریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

مغرب سے متاثر ہمارے دانشور مغرب کے بھی صرف ان حکماء اور فلاسفہ کو اپنا امام بناتے ہیں جو دین و مذہب کے ضمن میں ابطال اور تحقیر کا رویہ رکھتے ہیں۔ ورنہ وہاں بھی بعض چوٹی کے مفکّرین ایسے ہیں جو مذہبی ایمان وایقان کا مثبت طور پر اعتراف کرتے ہیں۔ چنانچہ مشہور فلسفی دریدا (Derida) اگرچہ عام معنوں میں مذہب مفکر نہیں ہے لیکن پھر بھی وہ ایک سچے صاحبِ ایمان کو authentic believer کہتا ہے یعنی مستند و معتبر فرد۔ اس جملے سے مذہب اور مذہبی عقائد کا اس کے ہاں احترام واضح ہے۔ محترمہ افنان قیوم کے خیال کے برعکس ہم مسلمانوں کی قرآن وسنت پر مبنی شناخت ہرگز انقباضی' تنگ اور گھٹی ہوئی نہیں بلکہ مصدقہ' یکسو اور شرح صدر سے مملو ہے اور بہت سے پیچیدہ روحانی ونفسیاتی امراض سے محفوظ رکھنے والی ہے' جس کی شہادت ہمیں سوشل میڈیا پر بہت سے ویڈیو کلپس کے ذریعے بھی ملتی ہے اور ان سب کا غلط یا جھوٹا ہونا بعید از قیاس ہے۔

حلقہ فکر غامدی سے تعلق رکھنے والے معروف دانشور اور صاحبِ قلم جناب خورشید ندیم کے بعض سیاسی تجزیے از حد فکر انگیز ہوتے ہیں جو ایک اہم اخبار کے کالموں میں پڑھنے کو ملتے ہیں۔ تاہم جاوید غامدی صاحب کے تلمیذ ہونے کے ناطے ان کی تحریروں میں استخفافِ حدیث کا معاملہ واضح طور پر نظر آتا ہے۔ اپنے ایک پچھلے کالم میں انہوں نے نہایت چونکا دینے والا فیصلہ (فتویٰ؟) صادر فرما دیا کہ اب عالمی معاملات' حوادث اور اتار چڑھاؤ میں مذہب اور مذہبی فکر کا کوئی عمل دخل نہ ہوگا۔ معلوم نہیں وہ یہ بات کس موڈ یا ترنگ میں لکھ گئے اور اس طرح انہوں نے نہ صرف قرآنی تصریحات بلکہ صحیح احادیث نبویہ کو بھی فراموش کر دیا جن کے مطابق حق اور باطل کی قوتیں تا قیام قیامت برسر پیکار رہیں گی۔ اسی طرح وہ سائنس اور سائنسی کاسمولوجیکل فکر اور حال ہی میں لی گئی بلیک ہول کی تصویر کے حوالے سے بھی سائنسی سوچ اور منہاج کے بہت گرویدہ دکھائی دیتے ہیں۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے اخلاقی' روحانی' موت اور بعد از موت (eschatology) کے سوالات سائنس کی دسترس

سے باہر ہیں۔ اس اعتبار سے خورشید ندیم سائنٹزم (scientism) کے زیر اثر زیادہ اور قرآنی مابعد الطبیعیاتی حقائق سے ہٹتے نظر آتے ہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ آج علم حیاتیات اور ٹیکنالوجی وہاں پہنچ گئی ہے جہاں زمین پر انسان کی بقا دشوار نظر آ رہی ہے۔ اسٹیفن ہاکنگ اور دوسرے ماہرینِ فلکیات اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ جدید سائنس انسانوں کے لیے کسی بہتر مستقبل کا پیغام نہیں ہے' یہ صرف عالمی اشرافیہ کے لیے مصنوعی ذہانت اور ڈیجیٹل طرزِ زندگی کا انتظام کر رہی ہے۔ اللہ جزائے خیر دے جناب عمر ابراہیم کو جو ہفتہ وار فرائیڈے اسپیشل میں گزشتہ چند ماہ کے دوران شائع شدہ مضامین میں جدید سائنسی فکر پر دینی نقطہ نظر سے انتہائی قیمتی خیالات کا اظہار کر رہے ہیں۔ ان کے تجزیے کے مطابق زمینی خدا بننے کی قدیم فرعونی خواہش جدید مغربی سائنس کا اصل بیانیہ ہے۔ مغرب کے ملحد معاشرے بہ یک وقت فلسفیانہ مایوسی اور سائنسی سرکشی سے دوچار ہیں۔

لاہور کی مشہور ایلیٹ یونیورسٹی LUMS میں چند روز قبل ہونے والا ایک واقعہ بھی قومی پریس میں جس طرح نمایاں کیا گیا ہے وہ جنسی ایٹمی دھماکے سے کم نہیں ہے اور تمام اہلِ فکر اور دینی حلقوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ یہ واقعہ مغربی تہذیب اور اس میں رنگے جانے کے عواقب کا شاخسانہ ہے۔ اس سارے واقعے کو دیکھنے اور حل کے لیے اگر آپ اسلامی تناظر یکسر نظر انداز کر کے مغربی تہذیب اور لبرل سوچ اور اقدار کے حوالے سے اسے دیکھیں گے تو آپ کو مؤقر انگریزی اخبار Dawn میں اس طرح کی سطریں ملیں گی:

- *Misogyny on campus.*
- *Tolerance of sexism is making female students unsafe.*

رپورٹ کے مطابق لمز کے چھ سو طلبہ نے طالبات کے بارے میں رکیک جنسی لطیفے اور غیر اخلاقی جملے فیس بک کے پیج پر اپ لوڈ کیے ہیں جن سے فیمیل سٹوڈنٹس کے جذبات کو نہ صرف ٹھیس پہنچی ہے' بلکہ اس پر انہوں نے شدید اعتراض کرتے ہوئے لمز کی انتظامیہ اور ڈین تک اپنی شکایات پہنچائی ہیں۔ انتظامیہ نے جواباً پوری طلبہ / طالبات کمیونٹی کو باہمی عزت واحترام (culture of respect) کو قائم کرنے کی ہدایات دی ہیں' درآں حالیکہ اس کا اصل اور پائیدار حل قرآن وسنت کی تعلیمات اور ان پر عمل ہے جس کی جانب توجہ بالکل نہیں ہے۔ جدیدیت اور سیکولرازم سے متاثر تمام حلقے طالبات اور خواتین سے متعلق ستر وحجاب اور شرم وحیا کے تمام احکام کو misogyny or paternalism کے تحت لاتے ہیں۔ اس کے نتائج مغربی ممالک کی طرح اب ہمارے ہاں بھی سامنے آ رہے ہیں۔ جوانی کی عمر میں طلبہ اور طالبات کا آزادانہ اختلاط اور لباس کے حوالے سے حد درجہ عریانی کا معاملہ ایسے حادثات سامنے لاتا ہے تو اس پر حیرانی نہیں ہونی چاہیے۔

ہمارے ہاں دنیاوی معاملات اور مادی ترجیحات کتنی حاوی ہوگئی ہیں' اس کی ایک مثال حال ہی میں سامنے آئی۔ لاہور کے ایک معروف اور انتہائی قابل آرتھوپیڈک سرجن پروفیشنل قابلیت کے ساتھ ساتھ خدمتِ خلق کے جذبے سے سرشار ہیں اور مریضوں سے انتہائی اچھے اخلاق ومروت سے پیش آتے ہیں۔ راقم کی ان سے

پندرہ بیس سال سے شناسائی ہے۔ ان کے کلینک پر جب بھی جانا ہوا' نہایت خندہ پیشانی سے ملے اور مرض کے علاج کے ساتھ ساتھ ملکی حالات اور دینی موضوعات پر بھی گفتگو رہتی۔ میں خاص طور پر برادرم ڈاکٹر اسرار احمدؒ کی اہم اور ان کی دلچسپی کی تصنیفات انہیں مسلسل دیتا رہا۔ مجھے ان کی وسیع المشربی کا علم تھا تاہم میں انہیں قرآن و حدیث کی عصری راہنمائی کے حوالے سے مواد مطبوعات ندائے خلافت' میثاق اور حکمت قرآن کی شکل میں بھی دیتا رہا' تاکہ خدمت خلق اور اچھے اخلاق کے ساتھ ساتھ ان میں احیائے اسلام اور فکر آخرت کا شعور بھی فروزاں ہو۔ لیکن انہوں نے چند روز قبل جو ایک انٹرنیشنل کانفرنس اور ڈنر کا اہتمام کیا اس کا موضوع Standard life, health and education کو بنایا' جس میں قطعاً کوئی حوالہ بلا واسطہ بھی دین و مذہب کا نہیں ہے۔ سورۃ الرعد کی آیت ۲۶ کا یہ حصہ اسی رویے کی عکاسی کرتا ہے:

﴿وَفَرِحُوْا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا مَتَاعٌ ﴾

''یہ تو دنیا کی زندگی میں مست ہو گئے۔ حالانکہ دنیا آخرت کے مقابلے میں محض ایک (نہایت حقیر) پونجی ہے۔''

دوسری جانب عام معاشرتی سطح پر ہماری نوجوان نسل کا معتدبہ حصہ بھی ایمانی اعتبار سے تہی دست' بے یقینی اور سیکولر تہذیب وتمدن کی غلامی کا مظہر ہے۔ یورپ اور امریکہ سے درآمد شدہ ملبوسات بالخصوص مردانہ شرٹس پر ایسی عبارتیں ہوتی ہیں جو کم از کم پڑھے لکھے مسلمان نوجوانوں کو زیب تن نہیں کرنی چاہئیں۔ قارئین نمونے کے طور پر ذرا یہ جملے دیکھیں جو ہمارے الہڑ اور تمام اخلاقی حدود کو پامال کرنے والے نوجوان (revellers) پہنے نظر آئے:

(i) Eat,sleep and drift.

(ii) I am dead; Wanna hook up.

پہلا جملہ مقصدیت اور اعلیٰ و ارفع آئیڈیل سے خالی حیوانی زندگی اور کھلنڈرے اور لذت پرست (hedonist) کی زندگی بسر کرنے کا اعلان ہے جبکہ دوسرے جملے میں اپنے مردہ یا قریب الموت ہونے اور کسی سہارے کی خواہش کا اظہار ہے۔ اگر یہ ٹی شرٹ کسی تنومند' لمبے' چوڑے چکلے اور جوان شخص نے پہنی ہو تو اس کی واقعاتی لغویت کا اندازہ آپ خود کر سکتے ہیں۔ روحانی اور اخلاقی طور پر بھی یہ عبارت قابلِ اعتراض ہے اور معمولی مذہبی حس رکھنے والا نوجوان بھی اسے زیب تن کرنے پر ٹھٹکے گا۔ اسی طرح کی بے شمار لچر اور بے ہودہ جملوں والی شرٹس راقم کی نظر سے گزری ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے نوجوانوں کا ذوق مذہب اور سنجیدگی سے کتنا دور ہوتا جا رہا ہے۔ علامہ اقبالؒ کی نظم ''جوابِ شکوہ'' کا یہ شعر اس صورت حال پر بالکل صحیح تبصرہ ہے:

ان کو تہذیب نے ہر بند سے آزاد کیا
لا کے کعبے سے صنم خانے میں آباد کیا

نبیٔ رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کی بد دعا

مدرّس: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

عَنِ الْبَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ رضی اللہ عنہ حَدِیْثُ هِجْرَةِ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم وَاَبِیْ بَکْرٍ مِنْ مَّکَّةَ اِلَی الْمَدِیْنَةِ، قَالَ: فِیْهِ سُرَاقَةُ بْنُ مَالِكِ بْنِ جُعْشُمٍ وَنَحْنُ فِیْ جَلَدٍ مِّنَ الْاَرْضِ، فَقُلْتُ: یَارَسُوْلَ اللّٰهِ اُتِیْنَا، قَالَ: ((لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا)) فَدَعَا عَلَیْهِ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَارْتَطَمَتْ فَرَسُهٗ اِلٰی بَطْنِهَا، فَقَالَ: اِنِّیْ قَدْ عَلِمْتُ اَنَّکُمَا دَعَوْتُمَا عَلَیَّ فَادْعُوَا لِیْ، وَاللّٰهِ لَکُمَا اَنْ اَرُدَّ عَنْکُمَا الطَّلَبَ، فَدَعَا اللّٰهَ فَنَجَا، فَرَجَعَ لَا یَلْقٰی اَحَدًا اِلَّا قَالَ: قَدْ کُفِیْتُمْ مَا هٰهُنَا فَلَا یَلْقٰی اَحَدًا اِلَّا رَدَّهٗ، وَفِیْ لَفْظٍ: فَسَاخَ فَرَسُهٗ فِی الْاَرْضِ اِلٰی بَطْنِهٖ وَوَثَبَ عَنْهُ وَقَالَ: یَا مُحَمَّدُ قَدْ عَلِمْتُ اَنَّ هٰذَا عَمَلُكَ، فَادْعُ اللّٰهَ اَنْ یُّخَلِّصَنِیْ مِمَّا اَنَا فِیْهِ، وَلَكَ عَلَیَّ لَاُعَمِّیَنَّ مَنْ وَّرَائِیْ (۱)

’’براء بن عازب رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی مکہ مکرمہ سے ہجرت کا واقعہ نقل کرتے ہوئے خود سراقہ بن مالک کا یہ بیان نقل کرتے ہیں‘ وہ کہتا ہے کہ ہم سخت پتھریلی زمین میں تھے تو ابوبکرؓ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! ہم تو اب پکڑ لیے گئے۔ آپؐ نے فرمایا: ’’فکر نہ کرو‘ یقین جانو اللہ ہمارے ساتھ ہے‘‘۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بد دعا دی تو اس کا گھوڑا پیٹ تک زمین میں دھنس گیا۔ اس نے کہا: اچھا میں سمجھ گیا تم دونوں نے مجھے بد دعا دی ہے۔ اچھا اب آپ دونوں میرے لیے نجات کی دعائے خیر کرو۔ اللہ کی قسم آپ دونوں کا احسان میرے اوپر ہے اور اس کے لیے میں اب یہ کروں گا کہ تمہیں ڈھونڈنے والوں کو یہیں سے لوٹا دوں گا۔ تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے حق میں دعا فرمائی تو وہ اس مصیبت سے نجات پا گیا۔ پھر سراقہ وہاں سے لوٹا اور راستے میں جس سے بھی ملتا سب کو وہیں سے واپس کر دیتا کہ جاؤ کچھ فکر کی ضرورت نہیں‘ وہ ادھر تو نہیں گئے۔ غرض جس سے بھی ملتا سب کو لوٹا دیتا۔ ایک روایت میں ہے کہ اس کا گھوڑا پیٹ تک زمین میں دھنس گیا تو وہ کود پڑا اور کہنے لگا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) میں سمجھ گیا یہ آپ ہی کا کام ہے۔ اب اللہ سے دعا کیجیے کہ وہ مجھے اس مصیبت سے‘ جس میں مَیں ہوں چھڑا دے اور میں آپ کے لیے یہ کروں گا کہ جو شخص بھی میرے پیچھے آئے گا اس کو دھوکے میں ڈال کر راستہ نہ بتاؤں گا۔‘‘

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے مدینہ ہجرت کے لیے نکلے تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپؐ کے ساتھ تھے۔ جونہی اس بات کی خبر کفارِ مکہ کو ہوئی تو انہوں نے آپؐ کی تلاش شروع کر دی اور اعلان کیا کہ جو کوئی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو گرفتار

(۱) رواہ الشیخان (بحوالہ ترجمان السنة‘ تالیف مولانا محمد بدر عالم)

کرے یا قتل کر دے تو اسے ایک دیت یعنی سو اونٹ کے برابر مال انعام دیا جائے گا۔ لوگ انعام کے لالچ میں نکل کھڑے ہوئے۔ سراقہ کو کسی نے بتایا کہ وہ اس طرف گئے ہیں' چنانچہ وہ گھوڑے پر سوار خفیہ طور پر حضور ﷺ کی تلاش میں نکل پڑا اور حضور ﷺ تک پہنچ گیا۔ آپؐ ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ پتھریلی زمین پر تھے۔ ابوبکر صدیقؓ نے دیکھا تو کہا حضور ﷺ ہم تو پکڑے گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''فکر نہ کرو اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ ہے''۔ پھر آپؐ نے بددعا دی تو سراقہ کا گھوڑا پیٹ تک زمین میں دھنس گیا۔ وہ گھوڑے سے کود گیا۔ اس نے گھوڑے کو ڈانٹا مگر اس کے پاؤں زمین میں دھنسے رہے۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ آپ ﷺ کی بددعا سے ہوا ہے' چنانچہ اس نے آپؐ سے امان چاہی۔ آپؐ نے اس کے حق میں دعا کی تو اس کے گھوڑے کے پاؤں زمین سے باہر نکل آئے۔ وہ آپؐ کا ممنون ہوا اور وعدہ کیا کہ میں واپس جا رہا ہوں' جو کوئی بھی مجھ سے پوچھے گا میں اسے آپؐ کے بارے میں نہ بتاؤں گا۔ اب آپؐ نے دوبارہ سفرِ ہجرت شروع کیا۔

سراقہ نے بعد ازاں نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اسلام قبول کر لیا۔ آپؐ نے اس سے فرمایا: ''سراقہ اس وقت تیری مسرت کا کیا عالم ہو گا جب تو کسریٰ کے کنگن پہنے گا!'' حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں ایران فتح ہوا تو کسریٰ کے کنگن خلیفۃ المسلمین کو پیش کیے گئے۔ انہوں نے وہ کنگن سراقہ کے ہاتھوں میں ڈال دیے اور کہا: سراقہ اب اُس ربّ کی تعریف کرو جس نے کسریٰ کے ہاتھوں سے یہ کنگن نکال کر تم جیسے دیہاتی کو پہنا دیے۔

نبی اکرم ﷺ کی نرمی اور رأفت کے باوجود چند بدبخت اور لعنتی ایسے بھی تھے جو آپؐ کی بددعا کے مستحق ہوئے۔ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ بیت اللہ کے پاس نماز ادا فرما رہے تھے' وہاں ایک اونٹ ذبح ہوا' اس کی اوجھڑی وہاں پڑی تھی۔ پاس ہی ابوجہل اور اس کے ساتھی بیٹھے تھے۔ ابوجہل کا اشارہ پا کر ایک بدنصیب نے وہ غلاظت بھری اوجھڑی حضور ﷺ کی پشت پر ڈال دی جب کہ آپؐ سربسجدے میں ڈالے ہوئے تھے۔ یہ دیکھ کر ابوجہل اور اس کے ساتھی قہقہے لگاتے ہوئے ایک دوسرے پر گر رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ بدستور سجدے میں تھے۔ کسی نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو خبر دی' وہ اس وقت کم سن تھیں' بھاگ کر آئیں اور آپؐ کے شانوں سے اوجھڑی اٹھا کر پھینک دی اور ان بدکرداروں کو برا بھلا کہنے لگیں۔ نماز سے فارغ ہو کر آپؐ نے باآوازِ بلند ان مشرکوں کو بددعا دی: ''اے اللہ! قریش سے انتقام لے''۔ چونکہ ان بدبختوں کو یقین تھا کہ آپ ﷺ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ بے نتیجہ نہیں رہیں گے لہٰذا سہم گئے۔ آپ ﷺ نے نام بنام ان مشرکوں کے لیے بددعا کی' چنانچہ یہ چھ سات لوگ جنگ بدر میں ذلت کی موت مر گئے' جہاں ان کی لاشوں کو گھسیٹ کر ایک کنویں میں ڈال دیا گیا۔'' (خلاصہ حدیث متفق علیہ عن ابن مسعودؓ)

ایک عیسائی مسلمان ہو گیا۔ وہ پڑھا لکھا تھا۔ اس نے سورۃ البقرۃ اور آل عمران کی کتابت کی۔ مگر پھر عیسائی ہو گیا اور کہنے لگا جو باتیں میں لکھ دیتا تھا محمد (ﷺ) وہی باتیں کہتے تھے۔ آپ ﷺ نے اس کے لیے

بددعا فرمائی: ''اے اللہ! اس کو ایسی سزا دے کہ وہ قدرت کی نشانی بن جائے''۔ اللہ تعالیٰ نے اسے موت دے دی۔ جب اس کو قبر میں ڈالا گیا تو قبر نے اسے باہر پھینک دیا۔ عیسائیوں نے اس کی لاش دوبارہ قبر میں ڈال دی مگر قبر نے اسے قبول نہ کیا۔ عیسائیوں نے اسے پھر قبر میں ڈال دیا مگر اس کی لاش پھر قبر سے باہر تھی۔ جب تیسری بار بھی ایسا ہی ہوا تب لوگ سمجھ گئے کہ یہ کام آدمیوں کا نہیں ہوسکتا۔ اب انہوں نے اسے یونہی باہر پڑا چھوڑ دیا۔ (متفق علیہ حدیث عن انس بن مالکؓ کا خلاصہ)

ابولہب نبی اکرم ﷺ کا چچا تھا۔ اس کے دونوں بیٹوں سے آپ ﷺ کی بیٹیوں کا نکاح ہوا تھا۔ جب آپؐ نے نبوت کا اعلان کیا تو ابولہب آپؐ کا سخت دشمن ہوگیا۔ اس کے حکم پر اس کے بیٹوں نے آپ ﷺ کی بیٹیوں (زینب اور اُم کلثوم رضی اللہ عنہما) کو قبل از رخصتی طلاق دے دی اور آپؐ کے ساتھ بدتمیزی کی۔ آپؐ نے بددعا دی: ''اے میرے اللہ اس پر اپنے کُتّوں میں سے کوئی کُتّا مسلّط کردے''۔ کچھ دنوں کے بعد ابولہب کا بیٹا عُتیبہ قریش کے ایک قافلے کے ساتھ سفر پر نکلا۔ ایک جگہ پڑاؤ کیا۔ وہاں شیر آتا تھا۔ عُتیبہ نے کہا کہ محمد (ﷺ) نے مجھ پر بددعا کی ہے' شیر مجھے کھا جائے گا۔ قافلے والوں نے رات عُتیبہ کو درمیان میں رکھا اور باقی لوگ اس کے اردگرد تھے۔ رات کو شیر آیا۔ سب کے بیچ میں گزرتا ہوا آگے آیا اور عُتیبہ کا سر پکڑ کر توڑ ڈالا۔ (رواہ ابن تیمیہ فی الجواب الصحیح)

ایک قبیلہ کے کُفّار رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ہمارے ساتھ حُفّاظِ قرآن کی ایک جماعت روانہ کردیجیے جو ہمارے لوگوں کو قرآن سکھائے اور دین اسلام کی تعلیمات سے آشنا کرے۔ آپ ﷺ نے ستر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ان کے ساتھ روانہ کردیا۔ ان بدبختوں نے بئر معونہ پہنچ کر ان سب کو شہید کردیا۔ آپ ﷺ کو خبر ہوئی تو آپؐ سخت غمگین ہوئے اور چالیس دن تک آپؐ ان کفار پر بددعا کرتے رہے۔

حدیث زیر مطالعہ میں بھی سراقہ انعام کے لالچ میں آپ ﷺ تک پہنچ گیا۔ آپؐ کی بددعا سے اس کا گھوڑا پیٹ تک پتھریلی زمین میں دھنس گیا۔ سراقہ کے مقدر نے یاوری کی اور وہ آپؐ کی دعا سے مسلمان ہوگیا۔ رسول اللہ ﷺ نے اسے بشارت دی اور ایک وقت آیا کہ اس کے ہاتھوں میں کسریٰ کے شاہی کنگن تھے۔

❁❁❁

اپنے ذاتی اوقات میں سے کم از کم نصف گھنٹہ نکال کر
''بیان القرآن'' کے ترجمہ وترجمانی کا ضرور مطالعہ کریں'
آپ یقیناً مستفید ہوں گے۔ (ان شاء اللہ!)

مِلاكُ التأوِيل (۱۷)

تالیف: ابوجعفر احمد بن ابراہیم بن الزبیر الغرناطی
تلخیص وترجمانی: ڈاکٹر صہیب بن عبدالغفار حسن

سُورۃُ الانعام

(۹۹) آیت ۲۵:

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ وَجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ۭ وَاِنْ يَّرَوْا كُلَّ اٰيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوْا بِهَا ۭ﴾

''اوران میں سے بعض ایسے ہیں جو آپ کی سُن گُن میں لگے رہتے ہیں' اور ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں کہ وہ اُسے سمجھ پائیں اوران کے کانوں میں ڈاٹ لگا رکھی ہے' وہ اگر ایک ایک نشانی کو بھی دیکھ لیں تو اس پر ایمان نہ لائیں گے۔''

اور سورۂ یونس کی آیت ۴۲' ۴۳ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ۝۴۲ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا لَا يُبْصِرُوْنَ ۝۴۳﴾

''اوران میں سے کچھ ایسے ہیں کہ جو آپ کی طرف کان لگائے رکھتے ہیں' تو کیا تم بہروں کو سنا سکتے ہو اگرچہ وہ کچھ سمجھ نہ رکھتے ہوں؟ اوراُن میں سے کچھ ایسے ہیں جو تمہاری طرف دیکھتے ہیں' تو کیا تم اندھوں کو ہدایت دے سکتے ہو اگرچہ وہ نہ دیکھ پاتے ہوں؟''

ملاحظہ فرمائیں کہ پہلی آیت میں فعل ''يَسْتَمِعُ'' مفرد کی ضمیر کے ساتھ آیا ہے اور دوسری آیت میں ''يَسْتَمِعُوْنَ'' جمع کے صیغے کے ساتھ آیا ہے' حالانکہ دونوں آیتوں کا مدعا ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ ان کا سننا بلا فائدہ ہے' تو سوال یہ ہے کہ ضمائر کا یہ اختلاف کیوں ہے جب کہ مقصد ایک ہے؟

جواباً عرض ہے' واللہ اعلم' کہ ''مَن'' کا لفظ مفرد کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور تثنیہ اور جمع کے لیے بھی' اور جب کبھی یہ لفظ استعمال ہوگا تو سب سے پہلے اس کا اطلاق لفظی اعتبار سے مفرد پر ہی ہوگا اور ''الَّذِیْ'' کی طرح اس کا صلہ یا صفت یا شرط یا استفہام مفرد کے صیغے کے ساتھ ہوگا۔ یعنی آپ یوں کہہ سکتے ہیں: ''مِنَ النَّاسِ مَنْ يَفْعَلُ كَذَا'' (اور لوگوں میں وہ بھی ہے جو ایسا کرتا ہے۔) اور بطورِ استفہام آپ کہہ سکتے ہیں: ''مَنْ يَفْعَلُ

ذٰلِكَ؟ (کون ہے جو ایسا کرتا ہے؟) یعنی لفظ کے اعتبار سے دونوں جگہ فعل مفرد آ رہا ہے اگرچہ معنی کے اعتبار سے بعض دفعہ ایک سے زائد شخص بھی مراد ہو سکتا ہے۔

اور بعض دفعہ چونکہ ''مَنْ'' سے مراد ہی جماعت ہوتی ہے اس لیے جملے میں بعد ازاں جمع کا صیغہ لایا جاتا ہے تاکہ یہ معلوم رہے کہ یہاں ''مَنْ'' سے مراد جماعت ہے فردِ واحد نہیں۔ مثلاً یوں کہے: ''مِنَ النَّاسِ مَنْ يَفْعَلُ كَذَا وَيُخْطِئُوْنَ فِيْ ذٰلِكَ'' (لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو یہ سب کچھ کرتے ہیں لیکن وہ غلط کرتے ہیں۔) یعنی شروع میں ''مَنْ'' صیغہ مفرد کے لیے ہے' لیکن اس کے بعد جمع کا صیغہ لا کر واضح کر دیا گیا کہ یہاں مراد جمع ہے مفرد نہیں۔

قرآن میں اس کی بہت سی مثالیں ہیں' جیسے ارشاد فرمایا:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ (البقرۃ:۸)

''اور لوگوں میں سے وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان لائے۔''

یہاں مَنْ کے ساتھ ''يَقُوْلُ'' مفرد کا صیغہ ہے' لیکن آیت کے آخر میں کہا ﴿وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۸﴾ ''حالانکہ وہ مؤمن نہیں ہیں۔'' یعنی ضمیر جمع ''هُمْ'' اور صیغہ جمع ''مُؤْمِنِيْنَ'' لا کر واضح کر دیا کہ یہاں مراد جماعت ہے۔

ایک دوسری مثال:

﴿وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَيَعْمَلْ صَالِحًا يُّدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾ (الطلاق:۱۱)

''اور جو اللہ پر ایمان لایا اور نیک عمل کرتا رہا وہ اسے جنتوں میں داخل کرے گا کہ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔''

یہاں يُؤْمِنْ، يَعْمَلْ، يُدْخِلْهُ تینوں جگہ مفرد کے صیغے ہیں' آخری جملے میں ''ہ'' کی ضمیر مفرد کے لیے ہے۔ پھر فرمایا: ''خٰلِدِيْنَ فِيْهَا'' وہ اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔''

اب یہاں ''خَالِدِيْنَ'' جمع کا صیغہ ہے۔ یعنی مراد جماعت ہے نہ کہ ایک فردِ واحد! اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ''مَن'' کے بعد تمام ضمائر مفرد کے لیے ہوں' حالانکہ وہاں بھی کثرت مراد ہو۔ اس کی ایک واضح مثال سورۃ البقرۃ کی ۲۰۴ سے ۲۰۶ تک کی یہ آیات ہیں:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝۲۰۴﴾

''اور لوگوں میں سے وہ بھی ہے کہ دنیوی زندگی کے بارے میں اُس کا قول تجھے اچھا لگتا ہے اور وہ جو کچھ بھی اس کے دل میں ہے اُس پر اللہ کو گواہ ٹھہراتا ہے' حالانکہ وہ بہت بڑا جھگڑالو ہے۔''

﴿وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝۲۰۵﴾

''اور جب وہ زمین میں اقتدار حاصل کرتا ہے تو وہاں فساد پر آمادہ ہو جاتا ہے اور کھیتی کو اور نسل کو ہلاک کرنا شروع کرتا ہے' اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔''

﴿وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ﴿۲۰۶﴾﴾

''اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر تو بطورِ گناہ بڑائی کا خیال اسے آ لیتا ہے' تو جہنم اس کے لیے کافی ہے' اور وہ بدترین ٹھکانہ ہے۔''

دیکھئے یہاں ''مَنْ'' کے بعد آٹھ (بلکہ گیارہ: مترجم) ضمائر لائی گئیں جو سب کی سب مفرد کے لیے ہیں' حالانکہ یہاں بھی مراد کثرت ہے' لیکن دراصل اس آیت میں اصلاً ایک ہی شخص کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے اور وہ ہے الاخنس بن شریق جس میں یہ ساری صفات پائی گئی تھیں کہ جو اس کے لیے موجبِ جہنم بنیں۔ (البتہ یہاں چونکہ اس شخص کا نام نہیں لیا گیا اس لیے قرآن کے عمومی اسلوب کے مطابق اس آیت کا حکم عام ہے' یعنی جس شخص میں بھی ایسی رذیل صفات پائی جائیں گی' اس کا بھی وہی انجام ہوگا جو الاخنس بن شریق کا ہوا: مترجم)

اور اسی طرح ارشاد فرمایا:

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ ائْذَنْ لِّيْ وَلَا تَفْتِنِّيْ ؕ اَلَا فِي الْفِتْنَةِ سَقَطُوْا ؕ وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيْطَةٌ ۢ بِالْكٰفِرِيْنَ﴿۴۹﴾﴾ (التوبۃ)

''اور ان میں سے کوئی کہتا ہے کہ مجھے اجازت دیجیے اور مجھے فتنے میں نہ ڈالیے۔ آگاہ رہو وہ تو فتنے میں پڑ چکے ہیں' اور جہنم کافروں کو گھیر لینے والی ہے۔''

یہ آیت ایک منافق الجد بن قیس کے بارے میں نازل ہوئی تھی کہ جب اسے رسول اللہ ﷺ نے رومیوں سے غزوۂ تبوک کے موقع پر جہاد کی دعوت دی تھی تو اس نے جہاد سے بھاگنے کے لیے یہ بہانہ گھڑا تھا کہ مجھے ساتھ نہ لے جائیں' اور وہ اس لیے کہ میں بنوالاصفر یعنی رومیوں کی عورتوں کو دیکھ کر صبر نہ کر سکوں گا۔

اسی طرح کی یہ آیت بھی ہے:

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ﴿۷۵﴾ فَلَمَّاۤ اٰتٰىهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُمْ مُّعْرِضُوْنَ﴿۷۶﴾﴾ (التوبۃ)

''اور ان میں سے وہ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر اللہ نے ہمیں اپنے فضل میں سے دیا تو ہم یقیناً صدقہ دیں گے اور نیکوکاروں میں سے ہو جائیں گے۔ اور پھر جب اللہ نے انہیں اپنے فضل سے نوازا تو وہ کنجوسی پر اُتر آئے اور کنارہ کش ہوتے ہوئے بھاگ کھڑے ہوئے۔''

یہ آیت بھی ایک خاص شخص ثعلبہ بن حاطب انصاری کے بارے میں نازل ہوئی۔

[استدراک از مترجم: ثعلبہ انصاری کے بارے میں روایت اہلِ تحقیق کے نزدیک صحیح نہیں ہے' اس لیے بہتر یہی ہوگا کہ ان کا نام خاص طور پر نہ لیا جائے بلکہ عمومی طور پر کہا جائے کہ یہ آیت ایک منافق کے بارے میں نازل ہوئی۔]

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ

(۱) ''مَنْ'' مفرد' تثنیہ' جمع سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اگر ''مَنْ'' کے بعد سارے صیغے (فعل' ضمائر) مفرد ہی کے ہوں تو ان کا اطلاق اس شخص پر ہوگا جس کے بارے میں آیت نازل ہوئی۔ لیکن پھر بھی اس

کا اطلاق عمومی طور پر ہوسکتا ہے‘ جیسا کہ سورۃ البقرۃ کی آیات ۲۰۴ تا ۲۰۶ کا بیان ہوا۔

(۲) اگر ’’مَنْ‘‘ کے بعد پہلے مفرد کا صیغہ استعمال ہو لیکن پھر جمع کا صیغہ بھی لایا جائے تو یہ دکھانا مقصود ہوتا ہے کہ یہاں پوری جماعت مراد ہے‘ صرف ایک شخص مراد نہیں‘ جیسے سورۃ الانعام کی آیت ۲۵‘ سورۃ البقرۃ کی آیت ۸ اور سورۃ الطلاق کی آیت ۱۱ سے معلوم ہوتا ہے۔

(۳) اگر آیت میں ’’مَن‘‘ کے بعد شروع ہی میں جمع کا صیغہ آ جائے‘ جیسے سورۂ یونس کی آیت ۴۲ میں وارد ہوا ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ۭ﴾ تو بھی یہ دکھانا مقصود ہوتا ہے کہ یہاں ایک شخص نہیں بلکہ جماعت مراد ہے۔ یہاں شروع ہی میں جمع کا صیغہ اس لیے لایا گیا کہ آیت کے پچھلے حصے میں کوئی فعل یا ضمیر ایسی نہیں ہے جو جمع کے صیغے پر دلالت کرتی ہو۔

اس پر یہ اعتراض وارد کیا جا سکتا ہے کہ جیسے سورۃ الانعام میں آیت (۲۴) کے پچھلے حصے میں ﴿وَجَعَلْنَا عَلٰي قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ﴾ لا کر واضح کیا گیا کہ یہاں جماعت مراد ہے مفرد نہیں‘ اسی طرح سورۂ یونس میں بھی تو بعد میں کہا گیا: ﴿اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ﴾ ’’کیا تم بہروں کو سنا سکتے ہو؟‘‘ اور یہ بھی تو جمع کا صیغہ ہے‘ تو ان دونوں آیات میں اختلاف کہاں ہوا؟ تو جواباً عرض ہے کہ سورۃ الانعام میں ’’عَلٰي قُلُوْبِهِمْ‘‘ ایسے ہی ہے جیسے یہ کہا جائے کہ ’’عَلٰي قُلُوْبِ السَّامِعِين‘‘ یعنی تمام سننے والے‘ گویا شروع میں جو لفظ ’’مَن‘‘ ذکر ہوا تھا اس سے مراد تمام جماعت سامعین ہے‘ اس کے بالمقابل سورۂ یونس میں لفظ الصُّمَّ (بہرے) سے مراد جنس صم مراد ہے‘ جیسے کہا جاتا ہے: زید نعم الرجل ’’زید‘ کیا ہی اچھا آدمی ہے‘‘ تو یہاں بھی جنس رجال مراد ہے‘ یہ نہیں کہ زید ہی صرف آدمی ہے!!

گویا یہاں پر نبی ﷺ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ بہرے جو کہ سمجھ نہیں پاتے‘ آپ کو انہیں سنانے کا مکلّف قرار نہیں دیا گیا ہے‘ اور یہ لوگ بھی اسی جنس سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی لیے آپ ان تک نہیں پہنچ سکتے‘ اور یوں دونوں آیتوں کے مضمون میں اختلاف دیکھا جا سکتا ہے۔

پھر اگر یہ کہا جائے کہ ’’مَنْ‘‘ کا اطلاق زیادہ تر جماعت پر ہوتا ہے (یعنی اس کے بعد اگر مفرد کا صیغہ لایا جائے تو اکثر جماعت ہی مراد ہوتی ہے) تو سورۂ یونس میں ’’مَنْ‘‘ کے بعد جمع کا صیغہ لانا ان صورتوں میں سے ہے جو بہت قلیل پائی جاتی ہیں —— تو کیا وجہ ہے کہ ایک قلیل صورتِ کلام کو اختیار کیا گیا؟ ہم جواب میں عرض کریں گے کہ یہ دونوں صورتیں فصاحت سے خالی نہیں ہیں‘ اور ایسا نہیں ہے کہ ایک صورتِ کلام قلیل ہو تو وہ فصاحت کے مقام سے گر جائے۔ سیبویہ نے اس پر یوں سرخی جمائی ہے:

’’باب اجراءِ هم صلة من وخبره‘‘ —— ’’باب‘ بابت مَنْ کا صلہ اور اس کی خبر‘‘

اور پھر واضح کیا کہ ’’مَنْ‘‘ سے مراد اگر دو شخص ہوں تو ’’اَلَّذِيْنَ‘‘ کی طرح اس کا صلہ بھی تثنیہ میں ہوگا اور اگر اس سے مراد جمع ہو تو اس کا صلہ بھی ’’اَلَّذِيْنَ‘‘ کی طرح ہوگا‘ جیسے آیت سورۂ یونس: ﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ۭ﴾ (گویا کلام اس طرح ہے: وَمِنْهُمُ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ) اور پھر سیبویہ نے اس پر مثالاً یہ شعر ذکر کیا ہے: ع

تَعَالَ فَإِنْ عَاهَدْتَنِيْ لَا تَخُوْنُنِيْ نَكُوْنُ مِثْلُ مَنْ يَا ذِيبُ يَصْطَحِبَانِ

''آ جا اور اگر تو مجھ سے یہ معاہدہ کرے کہ مجھ سے خیانت نہ کرے گا تو اے بھیڑیئے! ہم ان دو اشخاص کی طرح ہو جائیں گے جو ایک دوسرے کے مصاحب ہوں۔'' (دیوان فرزدق)

یہاں ''مَنْ'' کے بعد تثنیہ کا صیغہ لایا گیا' گویا ''مَنْ'' سے مراد ہے اَللَّذَانِ اسی طرح مَنْ سے مراد مؤنث ہو تو اس کے بعد ''اَلَّتِیْ'' کی طرح مؤنث کا صیغہ لایا جا سکتا ہے' جیسے کہا جائے: مَنْ کَانَتْ اُمُّكَ، وَاَیُّھُنَّ کَانَتْ' اور اسی طرح سورۃ الاحزاب کی یہ آیت مؤنث کے صیغے سے بھی قراءت کی گئی ہے: ﴿وَمَنْ تَقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ (آیت ۳۱)

اس ساری تفصیل سے معلوم ہو گیا کہ سورۃ الانعام میں ''مَنْ یَسْتَمِعُ اِلَیْكَ'' کے بعد جمع کے صیغے لا کر واضح کیا گیا تھا کہ یہاں جمع ہی مراد ہے اور مفرد نہیں' اور سورۂ یونس میں مَنْ کے فوراً بعد جمع کا صیغہ لانا اس لیے ضروری تھا کہ اس آیت کے بقیہ حصے میں جمع کا صیغہ نہیں آ رہا تھا' اس لیے مناسب تھا کہ مَنْ کے فوراً بعد ''یَسْتَمِعُوْنَ اِلَیْكَ'' کہہ کر واضح کر دیا جائے کہ یہاں مَنْ سے مراد جماعت ہے' مفرد نہیں۔ واللہ اعلم!

(۱۰۰) آیت ۲۹:

﴿وَقَالُوْٓا اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ ۝۲۹﴾

''یہ صرف اور صرف ہماری دنیوی زندگی ہے اور ہم دوبارہ اٹھائے نہیں جائیں گے۔''

اور سورۃ المؤمنون میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنْ هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ ۝۳۷﴾

''یہ صرف اور صرف ہماری دنیوی زندگی ہے' ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہم دوبارہ اٹھائے نہیں جائیں گے۔''

اور سورۃ الجاثیہ میں ارشاد فرمایا:

﴿وَقَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا وَمَا یُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ﴾ (آیت ۲۴)

''اور انہوں نے کہا کہ یہ (زندگی) صرف ہماری دنیوی زندگی ہے' ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہمیں ہلاک نہیں کرتا مگر زمانہ۔''

یہاں سوال کرنے والا سوال کر سکتا ہے کہ تینوں آیات کا حاصل ایک ہے کہ کفار نے اخروی زندگی کا انکار کیا' دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار کیا' لیکن باقی دونوں سورتوں میں ﴿نَمُوْتُ وَنَحْیَا﴾ کا اضافہ ہے اور سورۃ الجاثیہ میں ایک اور بات کہی گئی کہ ﴿وَمَا یُهْلِكُنَآ اِلَّا الدَّهْرُ ۚ﴾ لیکن ﴿وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِیْنَ﴾ کا ذکر نہیں ہے' تو اس کی کیا وجہ ہے؟

جواباً عرض ہے کہ سورۃ الانعام کی مذکورہ آیت سے پہلے صرف ان کے ایک ہی ادعاء کا ذکر ہوا ہے جو دوبارہ اٹھائے جانے کا انکار ہے۔ آیت ۲۷ ملاحظہ ہو:

﴿وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷﴾﴾

''اور کاش کہ تم دیکھو جب وہ آگ کے اوپر کھڑے کیے جائیں گے تو وہ کہیں گے اے کاش ہمیں لوٹایا جاتا تو پھر ہم اپنے رب کی آیات کا انکار نہ کرتے اور ایمان لانے والوں میں سے ہو جاتے۔''

گویا ان سے یوں کہا جا رہا ہے کہ تم لوگ اٹھائے جانے کا اور اخروی زندگی کا انکار کرتے رہے' اور اس سے زیادہ ان کی کوئی اور بات نقل نہیں کی گئی' اس لیے آیت ۲۹ میں انہی دونوں باتوں کا حوالہ دینا مناسب تھا۔

اور جہاں تک سورۃ المؤمنون کی آیت کا تعلق ہے تو اس سے قبل ذکر کیا گیا کہ کیسے اللہ کے رسول انہیں ایمان لانے کی طرف بلاتے رہے لیکن انہوں نے رسولوں کا مذاق اڑایا' یہ کہا کہ وہ بھی ہماری طرح صرف اس دنیوی زندگی کو گزار رہے ہیں' ان کے الفاظ یہ تھے:

﴿مَا هٰذَآ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يَاْكُلُ مِمَّا تَاْكُلُوْنَ مِنْهُ وَيَشْرَبُ مِمَّا تَشْرَبُوْنَ ﴿۳۳﴾﴾

''یہ شخص (یعنی رسول) تمہارے جیسا ایک بشر ہی تو ہے' وہی کھاتا ہے جسے تم کھاتے ہو اور وہی پیتا ہے جسے تم پیتے ہو۔''

اب جبکہ ان کے کلام میں بھی طوالت تھی کہ جس کی بنا پر وہ اپنی قوم کے بیوقوف لوگوں کو رسول کی مخالفت پر آمادہ کر رہے تھے' تو اگلی آیت میں ''نَمُوْتُ وَنَحْيَا'' کا اضافہ بھی مناسب تھا۔ مطلب یہ تھا کہ ہم میں سے ایک جماعت مرتی ہے تو ایک جماعت زندہ رہ جاتی ہے۔

اور یہ قرآن کا اسلوب ہے کہ جہاں بظاہر تکرار دکھائی دیتی ہے وہاں یا تو مزید افادہ ہوتا ہے یا کسی بھی معنی کو مکمل کیا جا رہا ہوتا ہے یا کسی کی بات پر بات رکھی جاتی ہے' یعنی تکرار بغیر کسی فائدے کے نہیں ہوتی۔

اب رہی سورۃ الجاثیہ کی آیت' تو یہ کفار کی بدعقیدگی کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ کائنات میں کوئی فاعل مختار نہیں ہے' بلکہ زمانے کے تصرفات ہی سے لوگ ہلاک ہوتے ہیں' تو نہ صرف انہوں نے اخروی زندگی کا انکار کیا' بلکہ اس بات کا بھی انکار کیا کہ مخلوقات کی اجل ایک معین وقت کے لیے ہے اور جب اللہ چاہتا ہے تو اس کے ارادے اور تقدیر سے موت واقع ہوتی ہے' اور پھر وہ ایک قدم اور آگے بڑھ گئے اور رسولوں کے سامنے سینہ زوری کرتے ہوئے یہ مطالبہ کرنے لگے کہ اگر تم سچے ہو تو پھر ہمارے آباء و اجداد کو زندہ کر کے دکھاؤ۔

﴿ائْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۵﴾﴾ ''لاؤ ہمارے اجداد کو اگر تم سچے ہو!''

اب چونکہ ان کی کئی اضافی باتیں بیان ہوئی ہیں' اس لیے ان کے تذکرے میں اضافی کلمات کا آنا مناسب تھا۔

(۱۰۱) آیت ۳۲ اور ۷۰:

﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ۭ﴾ (آیت ۳۲)

''اور دنیوی زندگی نہیں ہے مگر کھیل اور سامانِ غفلت۔''

﴿وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ ۙ

بِمَا كَسَبَتْ ۚ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ ۚ﴾ (آیت ۷۰)

''اور چھوڑ دو ان لوگوں کو جنہوں نے اپنے دین کو کھیل کود اور سامانِ غفلت بنا ڈالا ہے اور دنیوی زندگی نے انہیں دھوکے میں ڈال رکھا ہے' اور آپ انہیں اس قرآن سے نصیحت کرتے رہیں کہ مبادا کوئی نفس اپنے کرتوتوں میں ایسا گھر جائے کہ اللہ کے سوا نہ اس کا کوئی دوست رہے نہ سفارشی۔''

اور سورۃ الاعراف میں ارشاد فرمایا:

﴿قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّلَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ﴾ (آیت ۵۰'۵۱)

''اور وہ (جنتی لوگ) کہیں گے کہ اللہ نے ان دونوں چیزوں (یعنی جنت کا کھانا اور پینا) کو کفار پر حرام قرار دے دیا ہے' کہ ان لوگوں نے اپنے دین کو سامانِ غفلت اور کھیل کود بنا لیا تھا اور دنیوی زندگی نے انہیں دھوکے میں ڈال رکھا تھا۔''

اور سورۃ العنکبوت میں ارشاد ہوا:

﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ﴾ (آیت ۶۴)

''اور یہ دنیوی زندگی کیا ہے سوائے لہو و لعب کے۔''

اور سورۃ القتال (سورۃ محمدؐ) میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ۭ﴾ (آیت ۳۶)

''بے شک دنیوی زندگی کھیل ہے اور لہو ہے۔''

اور سورۃ الحدید میں ارشاد فرمایا:

﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ﴾ (آیت ۲۰)

''جان لو کہ دنیوی زندگی کھیل ہے اور لہو ہے۔''

یہاں بدیہی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ سورۃ الانعام کی دونوں آیتوں میں اور پھر سورۃ محمد اور سورۃ الحدید میں لعب (کھیل کود) کا ذکر پہلے ہے اور لھو (سامانِ غفلت) کا ذکر بعد میں ہے' اور سورۃ الاعراف اور سورۃ العنکبوت میں اس کا برعکس ہے' کہ پہلے لھو کا ذکر ہے اور پھر لعب کا۔ بطور وضاحت ہم عرض کرتے ہیں کہ دو الفاظ کے درمیان اگر واو عطف آتا ہے تو ضروری نہیں کہ اس میں ترتیب بھی ملحوظ ہو' لیکن چونکہ یہ الفاظ اللہ کی کتاب میں وارد ہوئے ہیں اس لیے کسی لفظ کا پہلے آنا یا بعد میں آنا کوئی نہ کوئی وجہ رکھتا ہے۔ اب ان آیات میں ''لَعِب'' کا ذکر پہلے ہے تو دُنیوی زندگی میں طبعی طور پر کھیل کود کی عمر پہلے آتی ہے' بچہ کھیل کود کر جوان ہوتا ہے' لیکن اگر یہ کھیل کود یا اس کے ساتھ کسی اور لایعنی مشغلے کا بھی اضافہ ہو جائے تو انسان پھر اگلے مرحلے میں داخل ہو جاتا ہے اور وہ ہے ''لھو'' یعنی غفلت کا مرحلہ' وہ اللہ تعالیٰ کی آیات میں غور و فکر کرنے سے غافل ہو جاتا ہے اور یوں اپنی ہلاکت کا سبب خود بنتا ہے' جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۡ﴾ (الاعراف:۱۷۹)

''اور ہم نے جہنم کے لیے بہت سے جنّوں اور انسانوں کو پیدا کیا ہے۔''

اب اگر یہ لوگ اندھوں بہروں کی طرح عقل سے کام نہیں لیتے' غفلت میں زندگی گزار دیتے ہیں' جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتے ہیں' اپنی خواہشات کے اسیر ہو کے رہ جاتے ہیں کہ جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ﴾ (الفرقان:۴۳) ''کیا دیکھا تم نے اس کو جس نے اپنی خواہش کو اپنا خدا بنا لیا؟'' اور پھر جب انسان اس حالت کو پہنچ جاتا ہے تو پھر سورۃ الانعام کی دوسری آیت کے بموجب نبیؐ کو حکم ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں سے کنارہ کشی کی جائے' فرمایا: ﴿وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا﴾ (آیت ۷۰) ''اور چھوڑ دو ان لوگوں کو جنہوں نے اپنے دین کو کھیل اور سامانِ غفلت بنا رکھا ہے''۔ اور اسی دنیوی حقیقت کو ان آیات میں بتایا گیا ہے' اور مقصد یہ تنبیہ کرنا ہے کہ دنیوی زندگی ایک دھوکہ ہے' اور انسان کو اس دھوکے میں نہیں آنا چاہیے۔ سورۃ الانعام کی آیات کے بعد سورۂ محمد میں بھی یہی الفاظ ''اِنَّمَا'' کے اضافے کے ساتھ دہرائے گئے: ﴿اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ؕ﴾ اور اس سے قبل اہلِ ایمان کو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے' اور کفار کے حال پر نکیر کی جا رہی ہے۔ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ مَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ۝﴾ (محمد)

''اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے اعمال کو ضائع نہ کرو۔ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا پھر وہ حالتِ کفر میں مر گئے تو اللہ ہرگز ان کی مغفرت نہیں کرے گا۔''

اس کے بعد سورۃ الحدید میں اسی ترتیب کے ساتھ یہی آیت آ رہی ہے: ﴿اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ﴾ (آیت ۲۰) اور یہاں بھی اہلِ ایمان کو بتایا جا رہا ہے کہ انسانی عمر کی ابتدا کے احوال کیا ہیں اور انتہا کہاں ہوتی ہے۔ آغاز کھیل کود سے ہوتا ہے اور پھر غفلت کے طاری ہو جانے کا مرحلہ آ جاتا ہے۔ مقصود یہی ہے کہ اس غفلت کو اپنے اوپر حاوی ہونے سے روکا جائے۔

اب آیئے سورۃ الاعراف کی طرف جہاں ''لَهْو'' کا پہلے ذکر ہے اور ''لَعِبَ'' کا بعد میں۔ یہ آیت جنت میں داخل ہونے والے اہل ایمان کے قول کا حصہ ہے جو کفار کے حال کا تذکرہ کر رہے ہیں کہ ان کے اعمال کیسے تھے جو انہیں اس بدانجام تک لے آئے۔ ''لَهْو'' یعنی ان کے غافل ہونے کا تذکرہ پہلے اس لیے کیا کہ جس چیز نے انہیں جہنم میں پہنچایا وہ ان کا یہی عمل تھا کہ انہوں نے بسبب غفلت اللہ تعالیٰ کی آیات میں غور و فکر نہیں کیا بلکہ ان کو جھٹلایا۔ چونکہ لھو کا تعلق سنِ تکلیف سے ہے یعنی ان کی عمر کا وہ مرحلہ جب وہ بالغ ہو چکے تھے اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مکلّف ہو چکے تھے تو ''لَهْو'' کا تذکرہ پہلے ہی مناسب تھا' اور جہاں تک ''لَعِب'' کا تعلق ہے تو اس کا اکثر حصہ سنِ تکلیف سے پہلے گزر چکا تھا' اس لیے ان کے انجامِ بد کا ذکر کرتے وقت ''لَعِب'' کا نہیں بلکہ ''لَهْو'' ہی کا پہلے ذکر کرنا مناسب ٹھہرا۔ گویا یوں کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جنت کی نعمتوں کو کافروں پر حرام

قرار دیا ہے‘ کیونکہ وہ زیادہ تر لھو ولعب میں مشغول رہے اور اپنی خواہشات کے اسیر رہے۔

اب رہی سورۃ العنکبوت کی آیت تو اس آیت سے قبل کی آیت ملاحظہ فرمائیں: ﴿وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ﴾ (آیت ۶۱) ’’اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور سورج اور چاند کو مسخر کیا تو وہ کہیں گے اللہ نے!‘‘

سوال و جواب اسی سے کیا جاتا ہے جو کھیل کود کے مرحلہ سے گزر چکا ہو اور سن تکلیف میں داخل ہو چکا ہو اور اس قابل ہو چکا ہو کہ اس سے حساب و کتاب کیا جائے اور اس کی کوتاہیوں پر اس کا محاسبہ کیا جائے۔ اس لیے مناسب تھا کہ یہاں بھی پہلے ’’لہو‘‘ کا تذکرہ کیا جائے کہ جو ان کے قبولِ حق میں مانع بنا اور ’’لَعِب‘‘ کا ذکر بعد میں ہو‘ جو دُنیوی زندگی کے اعتبار سے تو پہلے تھا لیکن حساب و کتاب کے لحاظ سے چونکہ اس کا تعلق نہ بنتا تھا اس لیے اس کا ذکر مؤخر کر دیا گیا۔ واللہ اعلم!

(۱۰۲) آیت ۳۲:

﴿وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۳۲﴾

’’اور اُخروی گھر بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا‘ تو کیا تم عقل نہیں رکھتے!‘‘

اور سورۃ الاعراف میں ارشاد فرمایا:

﴿وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۶۹﴾

’’اور اُخروی گھر بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں‘ تو کیا تم عقل نہیں رکھتے!‘‘

اور سورۃ یوسف میں ارشاد فرمایا:

﴿وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ اتَّقَوْا ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۰۹﴾

’’اور آخرت کا گھر بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو متقی ہوئے‘ تو کیا تم عقل نہیں رکھتے!‘‘

یہاں ضمناً ذکر کرتا چلوں کہ صاحبِ کتاب ’’درّۃ التنزیل‘‘ نے ان آیات کا تذکرہ اپنی کتاب میں نہیں کیا۔ یہاں تین سوالات پیدا ہوتے ہیں:

(۱) سورۃ الانعام میں فرمایا: ﴿وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ﴾ جو کہ لامِ قسم کے ساتھ ہے اور سورۃ الاعراف میں ﴿وَالدَّارُ﴾ بغیر لام کے ہے۔

(۲) پہلی دو آیتوں میں ’’الاٰخِرۃ‘‘ بطورِ صفت کے وارد ہوا ہے اور سورۂ یوسف میں بطورِ مضاف الیہ ﴿وَلَدَارُ الْاٰخِرَةِ﴾

(۳) پہلی دونوں آیات کے آخر میں ارشاد فرمایا: ﴿لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ﴾ اور سورۂ یوسف کے آخر میں ارشاد فرمایا: ﴿لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا﴾

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ سورۃ الانعام کی آیت سے قبل دنیا کی حالت ان الفاظ کے ساتھ بیان ہوئی ہے:

﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ﴾

یہاں ''مَا'' نافیہ کے بعد جو اسلوب اختیار کیا گیا ہے وہ کسی چیز کو مؤکد بنانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے کوئی شخص یہ کہے: مَا الْمَالُ اِلَّا الْاِبِلُ ''سوائے اونٹ کے اور تو کوئی سرے سے مال ہی نہیں'' یعنی اونٹ ہی حقیقی مال و دولت ہے اور اس کے علاوہ کوئی مال نہیں۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ یہ اسلوبِ بیان اس طرح کا ہے جہاں قسم کھا کر کوئی بات بیان کی جا رہی ہو' تو یہاں مناسب تھا کہ ''الدّار الاٰخرۃ'' کا بیان بھی قسمیہ حرف سے شروع ہوتا' اس لیے یہاں لام قسم لایا گیا اور فرمایا: ﴿وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ﴾ گویا یہ کہا جا رہا ہے: وَاللّٰهِ لَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ ''اللہ کی قسم! اُخروی گھر بہتر ہے۔''

سورۃ الاعراف کی آیت سے قبل ایسا کوئی اسلوبِ بیان نہیں تھا۔ صرف یہ کہا گیا تھا:

﴿فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى﴾ (آیت ۱۶۹)

''اور پھر ان کے بعد ایسے ناخلف لوگ آئے جو کتاب (توراۃ) کے وارث ہوئے اور اس دنیا کے ساز و سامان کے لینے میں مصروف ہو گئے۔''

اور یہاں چونکہ کوئی قسمیہ مضمون نہ تھا اس لیے صرف ﴿وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ﴾ کہنے پر اکتفا کیا گیا۔

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ پہلی دونوں آیات میں ''الدَّارُ الْآخِرَة'' صفت موصوف کی حیثیت سے آیا ہے' اس لیے کہ ان دونوں آیات سے قبل دنیوی زندگی کا صفت موصوف کی حیثیت ہی سے ذکر آیا ہے۔ سورۃ الانعام کی آیت سے قبل ارشاد فرمایا: ﴿وَقَالُوْٓا اِنْ هِيَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا﴾ **تو اس کے بالمقابل** ﴿وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ﴾ کہا گیا اور سورۃ الاعراف سے قبل ارشاد فرمایا: ﴿فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى﴾ یہاں ''الْاَدْنٰى'' سے مراد ''الدنیا'' ہے تو اس کے بالمقابل کہا: ''وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ'' اور چونکہ سورۃ یوسف کی آیت سے قبل ایسا کوئی ذکر نہیں ہے تو لفظ ''الاٰخِرَة'' ''دار'' کی اضافت کے ساتھ ذکر کیا گیا۔

اور تیسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ سورۂ یوسف کی آیت سے قبل کی آیت ملاحظہ فرمائیں: ﴿اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ﴾ (آیت ۱۰۹) ''کیا وہ زمین میں نہیں چلے پھرے؟'' حاصل کلام یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تو ہلاک ہوئے' لیکن اگر وہ تقویٰ اختیار کرتے تو نجات پا لیتے۔ یہاں ماضی کے احوال کا تذکرہ ہے' اس لیے ''لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا'' بھی ماضی کے صیغے کے ساتھ لایا گیا۔ واللہ اعلم!

(۱۰۳) آیت ۳۷:

﴿وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ﴾

''اور انہوں نے کہا کہ اس پر اس کے رب کی طرف سے کوئی آیت کیوں نہ نازل ہوئی؟''

اور سورۃ العنکبوت میں ارشاد فرمایا:

﴿وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ﴾ (آیت ۵۰)

''اور انہوں نے کہا: کیوں نہ اس پر اتریں آیات اس کے رب کی طرف سے؟''

سوال یہ ہے کہ جب دونوں آیتوں کا مقصود ایک ہی ہے تو پہلی آیت میں ''آیۃٌ'' مفرد کے صیغے سے اور دوسری میں ''آیات'' جمع کے صیغے سے کیوں لایا گیا؟

جواباً عرض ہے کہ ''لَوْلَا'' اُس وقت لایا جاتا ہے جب کسی کام پر ابھارنا مراد ہو اور متکلّم اُس وقت یہ اندازِ بیان اختیار کرتا ہے جب کسی ایسے کام پر اکسانا مقصود ہو جب بہت ہی اہم ہو یا اسے اولیت حاصل ہو یا اس کے بغیر کام پورا نہ ہوتا ہو۔ سورۃ الانعام کی مذکورہ آیت سے قبل چند ایسی نشانیاں ذکر کی گئی تھیں جو دقتِ نظر اور تفکّر و تدبّر کی محتاج تھیں' جیسے آسمان اور زمین کا پیدا کیا جانا' تاریکیوں اور نور کا بنایا جانا' ان لوگوں کے انجام کی طرف اشارہ جنہوں نے جھٹلایا تھا اور سرکشی اختیار کی تھی۔ اب یہ نشانیاں چونکہ ان کی سمجھ سے باہر تھیں اس لیے وہ ایک ایسی نشانی کے طالب ہوئے جو چونکا دینے والی ہو اور زیادہ بالغ نظری کی محتاج نہ ہو' جیسے صالح علیہ السلام کی اونٹنی۔ اور اسی وجہ سے ان کے کلام میں ایک تو صرف ایک نشانی کا مطالبہ کیا گیا اور دوسرے اس کے لیے ''نُزِّلَ'' (یعنی تشدید کے ساتھ) کا صیغہ لایا گیا جس میں تاکید پائی جاتی ہے۔ ان کے اس مطالبے کی تائید سورۃ الاسراء اور سورۃ الفرقان کی ان آیات سے بھی ہوتی ہے جن میں ایسے مطالبات کو بصراحت بیان کیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْۢبُوْعًا ۝۹۰ اَوْ تَكُوْنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا ۝۹۱﴾ (الاسراء)

''ہم ہرگز تجھ پر ایمان نہ لائیں گے جب تک کہ تم ہمارے لیے زمین میں سے ایک چشمہ پھاڑ کر نہ دکھا دو' یا یہ کہ تمہارے پاس کھجور اور انگور کا باغ ہو اور تم اس میں نہریں پھاڑ کر دکھا دو۔''

اور سورۃ الفرقان میں ارشاد فرمایا:

﴿لَوْ لَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ۭ﴾ (آیت ۲۱)

''ہمارے اوپر فرشتے کیوں نہیں اتارے جاتے یا ہم اپنے رب کو کیوں نہیں دیکھ پاتے!''

تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰٓى اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۳۷﴾ (الانعام)

''کہہ دیجیے (اے محمد ﷺ!) بے شک اللہ ایک نشانی اتارنے پر قادر ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔''

یعنی وہ نہیں جانتے کہ آگے کیا ہوگا' اگر نشانی اتاری گئی اور پھر بھی وہ ایمان نہ لائے تو پھر فوراً انہیں پکڑا جائے گا اور ویسے ہی ہلاک کر دیا جائے گا جیسے کہ پچھلی قومیں ہلاک ہوئی تھیں اور ان میں سے ایک قوم صالح تھی۔ اور اس بات کی طرف اس سورت میں پہلے ہی تنبیہ کی جا چکی تھی' فرمایا:

﴿وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ لَا يُنْظَرُوْنَ ۝۸﴾ (الانعام)

''اور اگر ہم نے فرشتہ اتار دیا ہوتا تو کام ہی تمام ہو جاتا اور پھر ان کو قطعاً مہلت نہ ملتی۔''

اور پھر اس آیت میں ''نُزِّلَ'' کو تشدید کے ساتھ اور لفظ آیۃٌ کو مفرد لانا وہ مفہوم عطا کرتا ہے جو ان کا مقصد تھا۔

اور یہ بھی واضح رہے کہ کسی نشانی کا اُتارا جانا یا نہ اتارا جانا اللہ کی حکمت کے تابع ہے‘ وہی جانتا ہے کہ کس کو ہدایت نصیب ہوگی اور کون گمراہی کا راستہ اختیار کرے گا اور یہ کہ کون ان نشانیوں میں تفکّر و تدبّر سے کام لے گا اور پھر ہدایت کا راستہ اختیار کرے گا۔

اب رہی سورۃ العنکبوت کی آیت تو اس سے قبل اور بعد ’’آیات‘‘ جمع کے صیغے سے آئی ہیں۔ فرمایا:

﴿بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ۭ﴾ (آیت ۴۹)

’’بلکہ وہ تو کھلی کھلی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جنہیں علم دیا گیا۔‘‘

اور فوراً بعد ارشاد ہوا:

﴿وَمَا يَجْحَدُ بِاٰيٰتِنَآ اِلَّا الظّٰلِمُوْنَ ۴۹﴾

’’اور ہماری نشانیوں کا انکار نہیں کرتے مگر ظالم لوگ۔‘‘

اور مذکورہ آیت کے فوراً بعد ارشاد فرمایا:

﴿قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ﴾ (آیت ۵۰)

’’کہہ دیجیے کہ بے شک نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں۔‘‘

صاف ظاہر ہے کہ جب ’’آیات‘‘ کا لفظ جمع کے صیغے سے بار بار وارد ہو رہا ہے تو یہاں مذکورہ آیت میں بھی جمع کے صیغے سے ’’آیات‘‘ لانا مناسب تھا نہ کہ مفرد کے صیغے سے‘ اور دوسری بات یہ کہ یہاں سورۃ الانعام کی مانند پہلے کوئی دھمکی آمیز تہدیدی کلام نہیں آیا ہے کہ ’’نُزِّلَ‘‘ تشدید کے ساتھ لایا جاتا‘ بلکہ اس کا بغیر تشدید کے ’’اُنْزِلَ‘‘ کہا جانا ہی مناسب تھا‘ واللہ اعلم!

(۱۰۴) آیات ۴۰‘ ۴۶‘ ۴۷:

﴿قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۴۰﴾

’’کہہ دیجیے‘ کیا تم غور سے نہیں دیکھتے‘ اگر تم پر اللہ کا عذاب آ پہنچے یا قیامت کی گھڑی آ جائے تو کیا تم اللہ کے سوا کسی کو پکارو گے؟ (بتاؤ) اگر تم سچے ہو!‘‘

﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰي قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ۭ﴾

’’کہہ دیجیے‘ کیا دیکھا تم نے اگر اللہ تمہاری سماعت اور بصارت کو چھین لے اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے‘ تو اللہ کے سوا کون سا معبود ہے جو تمہیں وہ لا کر دے دے؟‘‘

﴿قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ۴۷﴾

’’کہہ دیجیے‘ کیا تم نے غور کیا‘ اگر تم پر اللہ کا عذاب اچانک آ جائے یا علانیہ طور پر‘ تو پھر کون ہلاک ہوگا سوائے ظالموں کے؟‘‘

اور سورۂ یونس میں اس سے ملتی جلتی آیت ہے:

﴿قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ۝۵۰﴾

''کہہ دیجیے' کیا تم نے غور کیا' اگر اس کا عذاب تم پر رات کو یا دن کو آن پڑے تو اس میں وہ کون سی چیز ہے کہ مجرم لوگ اسے جلد مانگ رہے ہیں!''

یہاں چار سوال پیدا ہوتے ہیں:

(۱) سورۃ الانعام میں اس مضمون کی تکرار کا کیا سبب ہے؟

(۲) دو آیتوں میں ضمیر ''کُمْ'' لائی گئی ہے (اَرَءَيْتَكُمْ) جب کہ باقی دو آیات میں یہ لفظ بغیر اس ضمیر کے ہے (اَرَءَيْتُمْ)

(۳) ہر آیت کا آخری حصہ مختلف ہے۔

(۴) سورۃ الانعام کی تینوں آیات کی مذکورہ ترتیب میں کیا حکمت ہے؟

یعنی پہلی اور آخری آیت میں اللہ کے عذاب کے آنے کی وعید ہے جبکہ بیچ والی آیت میں سماعت و بصارت کے پکڑے جانے اور دلوں پر مہر لگانے کی بات کی گئی ہے؟

پہلے سوال کا جواب تو یہ ہے کہ یہاں ''قُلْ اَرَءَيْتُمْ'' بطورِ تنبیہ بار بار لایا گیا ہے تاکہ جو شخص عبرت حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ عبرت حاصل کر لے۔ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے سورۃ النمل میں ''قُلْ'' کے بعد ''اٰمَّن'' کی تکرار ہے۔ فرمایا:

﴿قُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ؕ آٰللّٰهُ خَيْرٌ اَمَّا يُشْرِكُوْنَ۝۵۹﴾

''کہہ دیجیے تمام تعریف اللہ کے لیے ہے' اور سلام ہو اُس کے ان بندوں پر جنہیں اس نے چُن لیا' کیا اللہ بہتر ہے یا وہ جس کو وہ شریک ٹھہراتے ہیں!''

اور پھر پانچ مرتبہ ''اٰمَّن'' کی تکرار ہے کہ مقصود اللہ کی نعمتوں کا یاد دلانا ہے۔ فرمایا:

﴿اَمَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ﴾ (آیت ۶۰)

''بھلا کون ہے جس نے آسمان اور زمین کو پیدا کیا!''

﴿اَمَّنْ جَعَلَ الْاَرْضَ قَرَارًا﴾ (آیت ۶۱)

''بھلا کون ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا؟''

﴿اَمَّنْ يُّجِيْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ﴾ (آیت ۶۲)

''بھلا کون ہے جو لاچار شخص کی پکار کو قبول کرتا ہے جب وہ اُسے پکارتا ہے!''

﴿اَمَّنْ يَّهْدِيْكُمْ فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ (آیت ۶۳)

''بھلا کون ہے جو تمہیں بر و بحر کی تاریکیوں میں ہدایت دیتا ہے!''

﴿اَمَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ﴾ (آیت ۶۴)

''بھلا کون ہے جو مخلوق کی اول دفعہ پیدائش کرتا ہے اور پھر دوبارہ اسے لوٹاتا ہے!''

تو جس طرح یہاں بار بار عبرت کی نگاہ سے دیکھنے کے لیے کہا گیا ہے ایسے ہی سورۃ الانعام کی آیات میں بھی تکرار سے توجہ دلانا مقصود ہے۔

اب رہا خطاب کے بعد ضمیر خطاب کا لانا (اَرَءَیْتَکُمْ) تو یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی سوتے ہوئے شخص کو جھنجھوڑا جائے یا انتہائی غفلت کے شکار شخص کو زبان کے تازیانوں سے للکارا جائے۔ ملاحظہ فرمائیں کہ اس آیت سے قبل ان کا یہ وصف بیان ہوا تھا:

﴿وَالَّذِیْنَ کَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا صُمٌّ وَّبُکْمٌ فِی الظُّلُمٰتِ ؕ﴾ (آیت ۳۹)

''اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا وہ تو بہرے اور گونگے ہیں' طرح طرح کی تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔''

تو اُن کو پھر بڑی تاکید سے نصیحت کرنا مطلوب تھا کہ جیسے ایک بہرے اور گونگے کو کی جانی چاہیے۔ پھر جب اس شدتِ کلام سے نصیحت ہوگئی تو اگلی آیت میں تاکید کی حاجت نہ رہی' اس لیے خطاب میں معمول کی طرح ''اَرَءَیْتُمْ'' کے صیغے سے خطاب کیا گیا' اور ایک ایسی بات سے نصیحت کی گئی جو عام مشاہدے میں آتی ہے' فرمایا:

﴿اِنْ اَخَذَ اللّٰہُ سَمْعَکُمْ وَاَبْصَارَکُمْ﴾ (آیت ۴۶) ''اگر اللہ تمہاری سماعت اور بصارت کو اچک لے۔''

اور پھر جب نصیحت کوئی انداز سے اجاگر کر دیا گیا تو دوبارہ پھر عذاب کا اور بدترین جزا کا ذکر کیا۔ یہاں پھر ضمیر خطاب (اَرَءَیْتَکُمْ) لاکر تاکید پر تاکید کی جارہی ہے۔ گویا جو نصیحت پکڑنے سے بھاگ رہا ہے اس پر بار بار کوڑے برسانے کا عمل جاری ہے' شاید یہ کہ وہ گمراہی سے باز آجائے۔

ہمارے اس بیان میں تمام باتوں کا جواب آگیا ہے۔

اب رہی سورۂ یونس کی آیت تو اس کا سیاق وسباق بھی ملاحظہ فرمائیں' وہاں اس سے قبل کسی بہرے گونگے کا ذکر نہیں ہے' صرف اتنا کہا تھا:

﴿قُلْ مَنْ یَّرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ یَّمْلِکُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ.....﴾ (آیت ۳۱)

''کہہ دیجیے' کون ہے جو تمہیں آسمان سے اور زمین سے رزق پہنچاتا ہے' یا کون ہے جو (تمہاری) سماعت اور آنکھوں پر پورا اختیار رکھتا ہے؟''

اور اس کے بعد کی آیات ـــــ یعنی انہیں نصیحت کے مختلف انداز کے ساتھ مخاطب کیا گیا اور اب آخر میں صرف عذاب سے ڈرانا باقی رہ گیا تھا' کہ اگر پچھلی نصیحت کارگر نہیں ہوئی تو پھر عذاب کا ڈراوا ہی باقی رہ جائے گا' اس لیے یہاں آخر میں ''اَرَءَیْتُمْ'' کے صیغے سے خطاب ہی مناسب تھا' تاکید کی ضرورت نہ تھی' واللہ اعلم!

(تتمہ: کتاب کی اگلی نوسطور میں ''اَرَءَیْتَکُمْ'' میں فعل کے ساتھ ضمیر متصل لانے کی نحوی بحث کی گئی ہے۔ خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ایسا کرنا صرف وہاں جائز ہے جہاں فعل کا معنی ظن ہو' جیسے ظَنَنْتُ' حَسِبْتُ اور ان کے ساتھ فَقَدْتُ اور عَدِمْتُ بھی شامل ہیں۔ یہاں ''رأیتُ'' چونکہ رؤیہ قلبیہ کے معنوں میں ہے' اس لیے یہاں بھی ایسا کرنا جائز ہوا' لیکن عموماً جائز نہیں۔) ❁❁❁

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم

ترتیب وتدوین: لطف الرحمٰن خان مرحوم

سورۃ التوبۃ

آیات ۱ تا ۶

بَرَآءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ فَسِيْحُوْا فِي الْاَرْضِ
اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِي الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَاَذَانٌ مِّنَ
اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ وَرَسُوْلُهٗ ۭ
فَاِنْ تُبْتُمْ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِي اللّٰهِ ۭ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـــًٔا وَّلَمْ
يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝
فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ
وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا
سَبِيْلَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى
يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ۝

س ی ح

سَاحَ یَسِیْحُ (ض) سَیْحًا: (۱) پانی کا زمین پر بہنا' زمین پر چلنا پھرنا۔ (۲) عبادت کے لیے پھرنا۔

سِحْ (فعل امر): تو چل پھر۔ زیر مطالعہ آیت ۲۔

سَائِحٌ (اسم الفاعل): عبادت کے لیے پھرنے والا' روزہ دار۔ ﴿اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ﴾ (التوبۃ: ۱۱۲) ''توبہ کرنے والے' عبادت کرنے والے' حمد کرنے والے' روزہ رکھنے والے۔''

ر ص د

رَصَدَ یَرْصُدُ (ن) رَصْدًا : گھات میں بیٹھنا۔

رَصَدٌ (اسم الفاعل کے مفہوم میں صفت): (واحد، جمع، مذکر، مؤنث سب کے لیے یکساں آتا ہے) گھات میں بیٹھنے والے۔ ﴿فَمَنْ یَّسْتَمِعِ الْاٰنَ یَجِدْ لَهٗ شِهَابًا رَّصَدًا ۝۹﴾ (الجن) ''پس جو کان لگائے گا اب تو وہ پائے گا اپنے لیے ایک گھات میں بیٹھا ہوا انگارہ۔''

مَرْصَدٌ (اسم الظرف) : گھات لگانے کی جگہ۔ زیر مطالعہ آیت ۵۔

مِرْصَادٌ (مِفْعَالٌ کے وزن پر اسم الآلہ): گھات میں بیٹھنے کا آلہ، پھر گھات لگانے کی مستقل جگہ کے لیے آتا ہے۔ ﴿اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا ۝۲۱﴾ (النبا) ''بے شک جہنم ہے گھات لگانے کی ایک مستقل جگہ۔''

اَرْصَدَ (افعال) اِرْصَادًا : گھات لگانے کے لیے کسی کو بٹھانا، نگران مقرر کرنا۔ ﴿وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ﴾ (التوبۃ:۱۰۷) ''اور نگران مقرر کرنے کو اس کے لیے یعنی اس کی طرف سے جس نے لڑائی کی اللہ سے اور اس کے رسول سے اس سے پہلے۔''

ترکیب: (آیت ۱) ''بَرَآءَةٌ'' خبر ہے۔ اس کا مبتدا محذوف ہے، جو کہ ''هٰذِهٖ'' ہوسکتا ہے۔ (آیت ۲) ''اَرْبَعَةَ'' پر نصب اس کے ظرفِ زمان ہونے کی وجہ سے ہے۔ (آیت ۳) ''اَذَانٌ'' کا مبتدا بھی محذوف ہے جو کہ ''هٰذَا'' ہوسکتا ہے۔ ''وَرَسُوْلُهٗ'' کی رفع بتا رہی ہے کہ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر ''بَرِیْٓءٌ'' محذوف ہے۔

ترجمہ:

بَرَآءَةٌ : (یہ اعلان) براءت ہے	مِّنَ اللّٰهِ : اللہ کی طرف سے
وَرَسُوْلِهٖٓ : اور اس کے رسول کی طرف سے	اِلَى الَّذِیْنَ : ان لوگوں کے لیے جن سے
عٰهَدْتُّمْ : تم نے معاہدہ کیا	مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ : مشرکوں میں سے
فَسِیْحُوْا : پس چل پھر لو	فِی الْاَرْضِ : زمین میں
اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ : چار مہینے	وَّاعْلَمُوْٓا : اور جان لو
اَنَّكُمْ : کہ تم	غَیْرُ مُعْجِزِی اللّٰهِ : اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو
	اللّٰهَ : اللہ
وَاَنَّ : اور یہ کہ	وَاَذَانٌ : اور (یہ) اعلان ہے
مُخْزِی الْكٰفِرِیْنَ : کافروں کو رسوا کرنے والا ہے	
مِّنَ اللّٰهِ : اللہ کی طرف سے	وَرَسُوْلِهٖٓ : اور اس کے رسولؐ کی طرف سے
اِلَى النَّاسِ : لوگوں کے لیے	یَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ : بڑے حج کے دن

اَنَّ : کہ

بَرِیۡٓءٌ : بری الذمہ ہے

وَرَسُوۡلُهٗ : اوراس کا رسولؐ (بھی)

تُبۡتُمۡ : تم توبہ کرلو

خَيۡرٌ : بہتر ہے

وَاِنۡ : اوراگر

فَاعۡلَمُوۡۤا : توجان لو

غَيۡرُ مُعۡجِزِى اللّٰهِ : اللہ کو عاجز کرنے والے نہیں ہو

الَّذِيۡنَ : ان لوگوں کوجنہوں نے

بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ : ایک دردناک عذاب کی

عٰهَدْتُّمۡ : تم نے معاہدہ کیا

ثُمَّ : پھر

شَيۡـئًا : کچھ بھی

عَلَيۡكُمۡ : تمہارے خلاف

فَاَتِمُّوۡۤا : توپورا کرو

عَهۡدَهُمۡ : ان کے عہد کو

اِنَّ اللّٰهَ : بے شک اللہ

الۡمُتَّقِيۡنَ : تقویٰ کرنے والوں کو

انۡسَلَخَ : گزرجائیں

فَاقۡتُلُوا : توقتل کرو

حَيۡثُ : جہاں

وَخُذُوۡهُمۡ : اورپکڑوان کو

وَاقۡعُدُوۡا : اوربیٹھو

كُلَّ مَرۡصَدٍ : ہرگھات لگانے کی جگہ پر

تَابُوۡا : وہ توبہ کریں

الصَّلٰوةَ : نماز

اللّٰهَ : اللہ

مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ : مشرکوں سے

فَاِنۡ : تواگر

فَهُوَ : تو یہ

لَّـكُمۡ : تمہارے لیے

تَوَلَّـيۡتُمۡ : تم نے منہ موڑا

اَنَّكُمۡ : کہ تم

وَبَشِّرِ : اورآپؐ خوشخبری دیں

كَفَرُوۡا : کفرکیا

اِلَّا الَّذِيۡنَ : سوائے ان کے جن سے

مِّنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ : مشرکوں میں سے

لَمۡ يَنۡقُصُوۡكُمۡ : انہوں نے کمی نہیں کی تم سے

وَّلَمۡ يُظَاهِرُوۡا : اورانہوں نے مدد نہیں کی

اَحَدًا : کسی ایک کی بھی

اِلَيۡهِمۡ : ان سے

اِلٰى مُدَّتِهِمۡ : ان کی مدت تک

يُحِبُّ : پسند کرتا ہے

فَاِذَا : پھرجب

الۡاَشۡهُرُ الۡحُرُمُ : محترم (یعنی پناہ والے) مہینے

الۡمُشۡرِكِيۡنَ : مشرکوں کو

وَجَدْتُّمُوۡهُمۡ : تم پاؤ ان کو

وَاحۡصُرُوۡهُمۡ : اورگھیروان کو

لَهُمۡ : ان کے لیے

فَاِنۡ : پھراگر

وَاَقَامُوا : اورقائم کریں

وَاٰتَوُا : اوراداکریں

الزَّكٰوةَ : زکوٰۃ	فَخَلُّوْا : تو چھوڑ دو
سَبِيْلَهُمْ : ان کا راستہ	اِنَّ اللّٰهَ : بے شک اللہ
غَفُوْرٌ : بخشنے والا ہے	رَّحِيْمٌ : رحم کرنے والا ہے
وَاِنْ : اور اگر	اَحَدٌ : کوئی ایک
مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ : مشرکوں میں سے	اسْتَجَارَكَ : پناہ مانگے آپؐ سے
فَاَجِرْهُ : تو آپؐ پناہ دیں اس کو	حَتّٰى : یہاں تک کہ
يَسْمَعَ : وہ سن لے	كَلٰمَ اللّٰهِ : اللہ کے کلام کو
ثُمَّ : پھر	اَبْلِغْهُ : آپؐ پہنچا دیں اس کو
مَاْمَنَهٗ : اس کی امن کی جگہ پر	ذٰلِكَ : یہ
بِاَنَّهُمْ : اس سبب سے کہ وہ لوگ	قَوْمٌ : ایک ایسی قوم ہیں جو
لَّا يَعْلَمُوْنَ : علم نہیں رکھتے	

نوٹ ۱: آیت ۳ میں ''حج اکبر'' کی اصطلاح آئی ہے' اس کو سمجھ لیں۔ ذوالحجہ کی مقررہ تاریخوں میں جو حج کیا جاتا ہے' اسے حج اکبر کہتے ہیں اور عمرے کو ''حج اصغر'' کہتے ہیں۔ کسی سال اگر یومِ عرفہ جمعہ کے دن ہو تو بعض لوگ اسے حج اکبر کہتے ہیں۔ یہ اصطلاح یقیناً غلط ہے' لیکن اس کی فضیلت سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ عرب لوگ اسے ''اجتماعِ سعدین'' کہتے ہیں اور اس کا احترام کرتے ہیں۔ کسی سال اگر عید جمعہ کے دن ہو تو اسے بھی ''اجتماعِ سعدین'' کہتے ہیں اور اس کی فضیلت کے بھی قائل ہیں۔

موجودہ صورتحال کا مجھے علم نہیں ہے' لیکن چند سال پہلے تک سعودی عرب میں مقامی لوگوں پر یہ پابندی تھی کہ ان میں سے کوئی شخص حج کر لیتا تھا تو آئندہ پانچ سال تک وہ حج نہیں کر سکتا تھا' تاکہ باہر سے آنے والے حاجیوں کے لیے گنجائش اور سہولت ہو' لیکن جس سال اجتماعِ سعدین ہوتا تھا' اس سال یہ پابندی اٹھالی جاتی تھی۔

نوٹ ۲: آیت ۵ میں حکم دیا گیا ہے کہ مشرکوں کو جہاں بھی پاؤ' انہیں قتل کرو' انہیں پکڑو' انہیں گھیرو اور ہر جگہ ان کے لیے گھات لگا کر بیٹھو۔ اسلام کے مخالفین' اسلام کو ایک انتہا پسند اور تشدد پسند مذہب قرار دینے کے لیے اس آیت کا بہت حوالہ دیتے ہیں۔ جب ان کی توجہ اس بات کی طرف مبذول کرائی جاتی ہے کہ اس حکم سے پہلے یہ شرط بھی ہے کہ ''جب پناہ کے یعنی نوٹس کے چار مہینے گزر جائیں'' تو وہ کہتے ہیں کہ پھر بھی یہ سخت زیادتی اور تشدد ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے سورۃ التوبہ کی آیات کی ترتیبِ نزولی اور ترتیبِ مصحف کے فرق کو اور اس کے وقت کے تاریخی پس منظر کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ اس لاعلمی کی وجہ سے ہمارے سادہ لوح مسلمان بھائی مخالفین کے اعتراض سے متاثر ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں' خواہ زبان سے نہ بھی کہیں' کہ ان کی بات درست ہے۔ اس سورہ کی ترتیبِ نزولی کو سمجھنے سے پہلے یہ بات بھی نوٹ کر لیں کہ رسول اللہ ﷺ جب تبوک کے لیے ۹ھ میں روانہ

ہوئے تھے تو رجب کا مہینہ تھا اور مدینہ واپس آئے تو رمضان کا مہینہ تھا۔ اس سفر میں پورے پچاس روز صَرف ہوئے۔ بیس دن تبوک میں قیام اور تیس دن آمد و رفت میں۔

سورۃ التوبہ تین خطبوں پر مشتمل ہے جو وقفہ وقفہ سے یکے بعد دیگرے نازل ہوئے۔ سب سے پہلے رکوع ۶ کی ابتدا سے رکوع ۹ کے اختتام کی آیات رجب ۹ ھ میں نازل ہوئیں۔ اُس وقت رسول اللہ ﷺ غزوۂ تبوک کی تیاری کر رہے تھے۔ اس میں اہلِ ایمان کو جہاد پر اُکسایا گیا ہے اور ان لوگوں پر ملامت کی گئی ہے جو غزوۂ تبوک میں شرکت سے جی چرا رہے تھے۔ اس کے بعد رکوع ۱۰ سے سورہ کے آخر تک کی آیات غزوۂ تبوک سے واپسی پر نازل ہوئیں۔ ان میں کچھ ٹکڑے ایسے بھی ہیں جو انہی ایام میں مختلف مواقع پر اترے، اور سب سے آخر میں، سورہ کے آغاز سے رکوع ۵ کے آخر تک کی آیات ذی القعدہ ۹ ھ میں نازل ہوئیں، جن میں مشرکوں کو چار مہینے کا نوٹس دیا گیا کہ اگر اسلام ان کے لیے قابل قبول نہیں ہے تو جہاں ان کا جی چاہے چلے جائیں اور عرب کا علاقہ خالی کر دیں۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ نوٹس کی مدت گزرنے کے بعد مشرکوں کو تلاش کرو، گھیرو اور پکڑ کر اپنے بااختیار حاکموں کے حوالے کر دو۔ ان کے سامنے اگر ان کا مشرک ہونا ثابت ہو گیا تو وہ ان کے قتل کا حکم دیں گے۔ اس سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلام ہر مرحلہ پر نظم و ضبط اور ڈسپلن کا مطالبہ کرتا ہے اور کسی بھی حال میں انارکی کی اجازت نہیں دیتا۔ اور اب اس ''سخت زیادتی اور تشدد'' والے حکم کی حقیقت کو سمجھنے کے لیے اس کے تاریخی پس منظر کو سمجھنا ہوگا۔

۶ ھ میں صلح حدیبیہ کے نتیجے میں مسلمانوں کو موقع ملا کہ وہ امن اور سکون سے اسلام کی تبلیغ کر سکیں۔ چنانچہ دو سال کی قلیل مدت میں عرب کے گوشے گوشے میں اسلام پھیل گیا۔ پھر ۸ ھ میں فتح مکہ نے مشرکوں کی کمر توڑ دی۔ عرب کے دیگر علاقوں میں جو مشرک باقی بچے تھے انہوں نے اپنی ساری طاقت مجتمع کر کے حنین کے میدان میں جھونک دی۔ وہاں شکست کھانے کے بعد جزیرہ نمائے عرب میں مشرکوں کا قلع قمع ہو گیا۔ صرف چند پراگندہ عناصر عرب کے مختلف گوشوں میں باقی رہ گئے تھے۔ ان گنے چنے لوگوں نے اب روم کی سرحد پر آباد عیسائی قبائل اور مدینہ کے منافقین کے ساتھ مل کر خفیہ سازشوں اور ریشہ دوانی کی راہ اختیار کی۔ اس کے نتیجے میں غزوۂ تبوک کی تیاری کے زمانے میں سُوَیْلِم کے گھر میں منافقین کا ایک گروہ جمع ہو کر مسلمانوں کو جنگ میں شرکت سے باز رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس گھر کو جلانے کا حکم دیا لیکن اس کے مکینوں اور وہاں جمع ہونے والے افراد کے قتل کا حکم نہیں دیا۔ انہی کی ریشہ دوانی سے مسجد ضرار قائم ہوئی۔ تبوک سے واپسی پر آپ ﷺ نے اسے مسمار کرنے اور جلانے کا حکم دیا لیکن اسے بنانے والوں کو قتل نہیں کرایا۔

اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر دیکھیں کہ اب اللہ تعالیٰ اس فساد کی جڑ کو اکھاڑنے کا حکم دے رہا ہے کہ ان کو چار مہینے کا نوٹس دو کہ یا تو اپنی حرکتوں سے باز آ جائیں یا اپنا سارا مال و دولت لے کر اپنے آقاؤں کے دیس میں منتقل ہو جائیں، ورنہ انہیں قتل کیا جائے گا۔ اب فیصلہ کریں کہ کون صحیح الدماغ انسان اسے سخت زیادتی اور تشدد

والا حکم قرار دے گا' اِلا یہ کہ اس کی نیت میں فتور ہو۔ کسی ریاست میں رہتے ہوئے' بیرونی طاقتوں سے ساز باز کر کے' ریاست کے خلاف ریشہ دوانی کرنے والے مجرموں کو جو سزا دی جاتی ہے اور ان کے ساتھ عملاً جو سلوک ہوتا ہے' وہ پوری دنیا جانتی ہے۔ ایسے مجرموں سے اسلام نے جو فراخ دلانہ سلوک کیا ہے اس کی کوئی ایک مثال بھی پوری تاریخ انسانیت سے دینا ممکن نہیں ہے۔ پھر بھی الزام اسلام پر ہے کہ یہ تشدد پسند ہے۔ ناطقہ سر بگریباں ہے' اسے کیا کہیے!

آیات ۷ تا ۱۶

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ كَيْفَ وَاِنْ يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ يُرْضُوْنَكُمْ بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ۭ اِنَّهُمْ سَاۗءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۝ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ ۭ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَىِٕمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ۝ اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ ۭ اَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ تَخْشَوْهُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنْصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَيَتُوْبُ اللّٰهُ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝

ء ل ل

اَلَّ يَؤُلُّ (ن) اَلًّا : کسی حالت کا اتنا صاف اور واضح ہونا کہ انکار ممکن نہ ہو۔ رشتہ دار ہونا۔

اِلٌّ : رشتہ داری۔ زیر مطالعہ آیت ۸۔

ذ م م

ذَمَّ يَذُمُّ (ن) ذَمًّا : کسی کی مذمت کرنا' برا بھلا کہنا۔

مَذْمُوْمٌ (اسم المفعول) : مذمت کیا ہوا۔ ﴿فَتَقْعُدَ مَذْمُوْمًا مَّخْذُوْلًا ۝﴾ (بنی اسراء یل) ''نتیجتاً تو بیٹھ رہے گا ملامت کیا ہوا' دھتکارا ہوا۔''

ذِمَّةٌ :ایسی ذمہ داری یا عہد جس کو پورا کرنا قابلِ مذمت ہو۔ زیرمطالعہ آیت ۸۔

ش ف ی

شَفٰی یَشْفِیْ (ض) شِفَاءً :کوئی مرض دور کر کے صحت دینا' شفا دینا۔ زیرمطالعہ آیت ۱۴۔

شِفَاءٌ (اسم ذات بھی ہے) :صحت یابی' شفا۔ ﴿فِیْهِ شِفَآءٌ لِّلنَّاسِ﴾ (النحل:۶۹) ''اس میں شفا ہے لوگوں کے لیے۔''

ترکیب :(آیت ۷) ''فَمَا اسْتَقَامُوْا'' میں ''مَا'' ظرفیہ ہے۔ (آیت ۸) ''کَیْفَ'' کے بعد پچھلا پورا جملہ ''یَکُوْنُ لِلْمُشْرِکِیْنَ عَهْدٌ'' محذوف ہے۔ (آیت ۱۱) ''فَاِخْوَانُکُمْ'' خبر ہے اور اس کا مبتدا ''هُمْ'' محذوف ہے۔ (آیت ۱۳۔۱۵) ''قَاتِلُوْهُمْ'' فعل امر ہے۔ اس کا جوابِ امر ہونے کی وجہ سے آگے ''یُعَذِّبْ، یُخْزِ، یَنْصُرْ، یَشْفِ'' اور ''یُذْهِبْ'' مجزوم ہیں اور ان کے ساتھ واؤ عاطفہ ہیں' جبکہ ''وَیَتُوْبُ اللّٰهُ'' کا واؤ عاطفہ نہیں بلکہ استینا فیہ ہے' کیونکہ ''یَتُوْبُ'' مجزوم نہیں ہوا ہے۔

ترجمہ:

کَیْفَ :کیسے	یَکُوْنُ :ہوگا
لِلْمُشْرِکِیْنَ :مشرکوں کے لیے	عَهْدٌ :کوئی عہد
عِنْدَ اللّٰهِ :اللہ کے پاس	وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ :اور اس کے رسول کے پاس
اِلَّا :سوائے	الَّذِیْنَ :ان کے جن سے
عٰهَدْتُّمْ :تم لوگوں نے معاہدہ کیا	عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ :مسجد حرام کے پاس
فَمَا :پس جب تک	اسْتَقَامُوْا :وہ سیدھے رہیں
لَکُمْ :تمہارے لیے	فَاسْتَقِیْمُوْا :تو تم بھی سیدھے رہو
لَهُمْ :ان کے لیے	اِنَّ اللّٰهَ :بے شک اللہ
یُحِبُّ :پسند کرتا ہے	الْمُتَّقِیْنَ :تقویٰ کرنے والوں کو
کَیْفَ :کیسے (ہوگا کوئی عہد)	وَ :اس حال میں کہ
اِنْ :اگر	یَّظْهَرُوْا :وہ غالب ہوں
عَلَیْکُمْ :تم لوگوں پر	لَا یَرْقُبُوْا :تو وہ لحاظ نہیں کریں گے
فِیْکُمْ :تم میں	اِلًّا :کسی رشتہ داری کا
وَّلَا ذِمَّةً :اور نہ کسی عہد کا	یُرْضُوْنَکُمْ :وہ راضی کرتے ہیں تم کو
بِاَفْوَاهِهِمْ :اپنے مونہوں سے (یعنی باتوں سے)	وَ :حالانکہ
تَاْبٰی :انکار کرتے ہیں	قُلُوْبُهُمْ :ان کے دل

وَاَكْثَرُهُمْ : اوران کے اکثر
اِشْتَرَوْا : انہوں نے خریدا
ثَمَنًا قَلِيْلًا : تھوڑی سی قیمت کو
عَنْ سَبِيْلِهٖ : اُس کی راہ سے
سَآءَ : کتنا برا ہے
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ : وہ کرتے ہیں
فِيْ مُؤْمِنٍ : کسی مؤمن (کے بارے) میں
وَّلَا ذِمَّةً : اور نہ کسی عہد کا
هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ : ہیں ہی حد سے تجاوز کرنے والے
تَابُوْا : وہ توبہ کریں
الصَّلٰوةَ : نماز
الزَّكٰوةَ : زکوٰۃ
فِي الدِّيْنِ : دین میں
الْاٰيٰتِ : آیات کو
يَّعْلَمُوْنَ : علم رکھتے ہیں
نَّكَثُوْٓا : وہ توڑ دیں
مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ : اپنے عہد کے بعد سے
فِيْ دِيْنِكُمْ : تمہارے دین میں
اَئِمَّةَ الْكُفْرِ : کفر کے سرداروں سے
لَآ اَيْمَانَ : کہ کسی طرح کی کوئی بھی قسم نہیں ہے
لَعَلَّهُمْ : شاید وہ لوگ
اَ : کیا
قَوْمًا : ایک ایسی قوم سے
اَيْمَانَهُمْ : اپنی قسموں کو
بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ : ان رسولؐ کو نکالنے کا
بَدَءُوْكُمْ : ابتدا کی تم سے (زیادتی کرنے کی)

فٰسِقُوْنَ : عہد سے نکلنے والے ہیں
بِاٰيٰتِ اللّٰهِ : اللہ کی آیات کے بدلے
فَصَدُّوْا : پھر انہوں نے روکا
اِنَّهُمْ : بے شک وہ لوگ
مَا : جو
لَا يَرْقُبُوْنَ : وہ لحاظ نہیں کرتے
اِلًّا : کسی رشتہ داری کا
وَاُولٰٓئِكَ : اور وہ لوگ
فَاِنْ : پھر اگر
وَاَقَامُوا : اور قائم کریں
وَاٰتَوُا : اور ادا کریں
فَاِخْوَانُكُمْ : تو (وہ) تمہارے بھائی ہیں
وَنُفَصِّلُ : اور ہم کھول کھول کر بیان کرتے ہیں
لِقَوْمٍ : ایسے لوگوں کے لیے جو
وَاِنْ : اور اگر
اَيْمَانَهُمْ : اپنی قسموں کو
وَطَعَنُوْا : اور طعنہ دیں
فَقَاتِلُوْٓا : تو تم جنگ کرو
اِنَّهُمْ : بے شک وہ لوگ (ایسے) ہیں
لَهُمْ : ان کے لیے
يَنْتَهُوْنَ : باز آجائیں
لَا تُقَاتِلُوْنَ : تم جنگ نہیں کرو گے
نَّكَثُوْٓا : جس نے توڑا
وَهَمُّوْا : اور ارادہ کیا
وَهُمْ : اور انہوں نے
اَوَّلَ مَرَّةٍ : پہلی مرتبہ

اَ : کیا	تَخْشَوْنَهُمْ :تم ڈرتے ہوان سے
فَاللّٰهُ :تو اللہ	اَحَقُّ :زیادہ حق دار ہے
اَنْ : کہ	تَخْشَوْهُ :تم ڈرو اس سے
اِنْ :اگر	كُنْتُمْ :تم لوگ ہو
مُّؤْمِنِيْنَ :ایمان لانے والے	قَاتِلُوْهُمْ :جنگ کرو ان سے
يُعَذِّبْهُمْ : تو عذاب دے گا ان کو	اللّٰهُ :اللہ
بِاَيْدِيْكُمْ :تمہارے ہاتھوں سے	وَيُخْزِهِمْ :اور وہ رسوا کرے گا ان کو
وَيَنْصُرْكُمْ :اور وہ مدد کرے گا تمہاری	عَلَيْهِمْ :ان کے خلاف
وَيَشْفِ :اور وہ شفا دے گا	صُدُوْرَ قَوْمٍ مُّؤْمِنِيْنَ :ایمان لانے والے لوگوں کے سینوں کو
وَيُذْهِبْ :اور وہ لے جائے گا	غَيْظَ قُلُوْبِهِمْ:ان کے دلوں کے غیظ وغضب
وَيَتُوْبُ :اور توبہ قبول کرے گا	اللّٰهُ :اللہ
عَلٰى مَنْ :اس کی جس کی	يَّشَآءُ :وہ چاہے گا
وَاللّٰهُ :اور اللہ	عَلِيْمٌ :جاننے والا ہے
حَكِيْمٌ :حکمت والا ہے	اَمْ :یا
حَسِبْتُمْ :تم لوگوں نے گمان کیا	اَنْ :کہ
تُتْرَكُوْا :تمہیں چھوڑ دیا جائے گا	وَ :حالانکہ
لَمَّا يَعْلَمِ :ابھی تک نہیں جانا	اللّٰهُ :اللہ نے
الَّذِيْنَ :ان کو جنہوں نے	جٰهَدُوْا :جہاد کیا
مِنْكُمْ :تم میں سے	وَلَمْ يَتَّخِذُوْا :اور انہوں نے نہیں بنایا
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ :اللہ کے سوا	وَلَا رَسُوْلِهٖ :اور نہ اس کے رسول کے سوا
وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ :اور نہ مؤمنوں کے سوا	وَلِيْجَةً :کسی کو دل کا بھیدی
وَاللّٰهُ :اور اللہ	خَبِيْرٌ :باخبر ہے
بِمَا :اس سے جو	تَعْمَلُوْنَ :تم کرتے ہو

نوٹ: جنگ (War) کے لیے قرآن مجید کی اصطلاح ''قِتَال'' ہے اور آیات ۱۲، ۱۳، ۱۴ میں اسی لفظ کے مختلف صیغے استعمال ہوئے ہیں، کیونکہ وہاں جنگ کا حکم دینا مقصود تھا۔ لیکن آیت ۱۶ میں یہ بتانا مقصود ہے کہ قیامت میں جہنم سے نجات اور جنت میں داخلہ کے لیے صرف ایمان کا زبانی اقرار کافی نہیں ہے، بلکہ اس کی کچھ اور بھی

شرائط ہیں۔ اس آیت میں پہلی شرط کی نشاندہی کرنے کے لیے لفظ قِتَال کے بجائے لفظ جِہَاد کا فعل ماضی لایا گیا ہے۔ اس فرق کو سمجھنے کے لیے لفظ جِہَاد کا پورا مفہوم واضح ہونا ضروری ہے۔

جہاد کا مطلب ہے کسی مقصد کے لیے جِدّوجُہد کرنا' جبکہ قرآن کی ایک اصطلاح کے طور پر اس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کے لیے جدوجہد کرنا' اور قرآن میں یہ لفظ عموماً اسی مفہوم میں آیا ہے' خواہ ''فی سبیل اللہ'' کے الفاظ لفظاً مذکور ہوں یا نہ ہوں۔ اس کے تین مرحلے ہیں۔ پہلا مرحلہ یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کے ساتھ جدوجہد کر کے اسے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کا عادی بنائے۔ اسے جہاد مع النفس کہتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ نے اسے افضل جہاد قرار دیا ہے۔ یہ فرضِ عین ہے اور جنت میں داخلہ کی شرط کے طور پر یہی مرحلہ مراد ہے۔

اپنے آپ کو اللہ کی اطاعت کا عادی بنا لینے کے بعد انسان کو مطمئن نہیں ہو جانا چاہیے' بلکہ اب دوسروں کو جہنم سے بچانے کے لیے اسلام کی دعوت وتبلیغ کی جدوجہد میں حصہ لینا چاہیے۔ اس میں اپنا وقت' اپنی صلاحیت اور اپنا پیسہ صرف کرنا چاہیے۔ یہ جہاد فی سبیل اللہ کا دوسرا مرحلہ ہے اور یہ فرضِ عین نہیں بلکہ فرضِ کفایہ ہے۔ (دیکھیں النساء: ۹۵' نوٹ ۲)۔ پھر اگر ضرورت پڑے تو اسلام کی سربلندی کے لیے جنگ میں حصہ لینا چاہیے۔ یہ جہاد فی سبیل اللہ کا تیسرا مرحلہ ہے اور اسے قتال فی سبیل اللہ کہتے ہیں۔ یہ بھی فرضِ کفایہ ہے' اِلّا یہ کہ اسلامی حکومت کے امیر کی طرف سے نفیرِ عام (General Mobilisation) کا حکم ہو۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں تمام غزوات میں شرکت فرضِ کفایہ تھی' سوائے غزوۂ تبوک کے' جس میں شرکت فرضِ عین ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں شرکت نہ کرنے والوں سے باز پرس ہوئی تھی۔

آیات ۱۷ تا ۲۴

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰۗىِٕكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ۝ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاۗجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ۝ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَاۗءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَاۗءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَاۗؤُكُمْ وَاَبْنَاۗؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ

وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝

ك س د

كَسَدَ يَكْسُدُ (ن)، كَسُدَ يَكْسُدُ (ك) كَسَادًا : بازار کا مندا ہونا۔ زیر مطالعہ آیت ۲۴۔

ترکیب : (آیت ۱۹) ''اَلْحَاجِّ'' پر لامِ جنس ہے۔ اس لیے ترجمہ جمع میں ہوگا۔ (آیت ۲۱) ''بِرَحْمَةٍ'' کی با پر عطف ہونے کی وجہ سے ''رِضْوَانٍ'' اور ''جَنّٰتٍ'' حالتِ جر میں آئے ہیں۔ (آیت ۲۴) ''اٰبَآؤُكُمْ'' سے ''مَسٰكِنُ'' تک ''كَانَ'' کے اسم ہیں، اس لیے یہ سب حالتِ رفع میں ہیں۔ ''اَحَبَّ'' باب افعال کا فعل ماضی نہیں ہے بلکہ ''مَحَبَّةٌ'' سے ''اَفْعَلُ'' کے وزن پر افعل التفضیل ہے اور ''كَانَ'' کی خبر ہونے کی وجہ سے حالتِ نصب میں آیا ہے۔

ترجمہ:

مَا كَانَ : نہیں ہے	لِلْمُشْرِكِيْنَ : مشرکوں کے لیے
اَنْ : کہ	يَّعْمُرُوْا : وہ آباد کریں
مَسٰجِدَ اللّٰهِ : اللہ کی مسجدوں کو	شٰهِدِيْنَ : گواہ ہوتے ہوئے
عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ : اپنے اوپر	بِالْكُفْرِ : کفر کے
اُولٰٓئِكَ : وہ لوگ ہیں	حَبِطَتْ : (کہ) اکارت ہوئے
اَعْمَالُهُمْ : جن کے اعمال	وَفِي النَّارِ : اور آگ میں ہی
هُمْ : وہ لوگ	خٰلِدُوْنَ : ہمیشہ رہنے والے ہیں
اِنَّمَا : کچھ نہیں سوائے اس کے کہ	يَعْمُرُ : آباد کرتا ہے
مَسٰجِدَ اللّٰهِ : اللہ کی مسجدوں کو	مَنْ : وہ، جو
اٰمَنَ : ایمان لایا	بِاللّٰهِ : اللہ پر
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ : اور آخری دن پر	وَاَقَامَ : اور اس نے قائم کی
الصَّلٰوةَ : نماز	وَاٰتَى : اور ادا کی
الزَّكٰوةَ : زکوٰۃ	وَلَمْ يَخْشَ : اور وہ نہیں ڈرا
اِلَّا : مگر	اللّٰهَ : اللہ سے
فَعَسٰٓى : تو امید ہے	اُولٰٓئِكَ : وہ لوگ
اَنْ : کہ	يَّكُوْنُوْا : ہو جائیں
مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ : ہدایت پانے والوں میں سے	اَ : کیا

جَعَلْتُمْ :تم لوگوں نے بنایا
وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ :اور مسجد حرام کی آبادی کو
اٰمَنَ :ایمان لایا
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ :اور آخری دن پر
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ :اللہ کی راہ میں
عِنْدَ اللّٰهِ :اللہ کے پاس
لَا يَهْدِي :ہدایت نہیں دیتا
اَلَّذِيْنَ :جولوگ
وَهَاجَرُوْا :اور ہجرت کی
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ :اللہ کی راہ میں
وَاَنْفُسِهِمْ :اور اپنی جانوں سے
دَرَجَةً :بلحاظ درجہ کے
وَاُولٰٓئِكَ :اور وہ لوگ
يُبَشِّرُهُمْ :خوشخبری دیتا ہے ان کو
بِرَحْمَةٍ :رحمت کی
وَرِضْوَانٍ :اور رضامندی کی
لَّهُمْ :ان کے لیے
نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ :قائم رہنے والی خوشحالی ہے
فِيْهَآ :ان میں
اِنَّ اللّٰهَ :بے شک اللہ
اَجْرٌ عَظِيْمٌ :عظیم اجر ہے
اٰمَنُوْا :ایمان لائے
اٰبَآءَكُمْ :اپنے آباء واجداد کو
اَوْلِيَآءَ :کارساز
اسْتَحَبُّوا :وہ ترجیح دیں
عَلَى الْاِيْمَانِ :ایمان پر
سِقَايَةَ الْحَآجِّ :حاجیوں کی سبیل کو
كَمَنْ :اس کے جیسا جو
بِاللّٰهِ :اللہ پر
وَجٰهَدَ :اور اس نے جدوجہد کی
لَا يَسْتَوٗنَ :وہ برابر نہیں ہوتے
وَاللّٰهُ :اور اللہ
الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ :ظالم لوگوں کو
اٰمَنُوْا :ایمان لائے
وَجٰهَدُوْا :اور جدوجہد کی
بِاَمْوَالِهِمْ :اپنے مالوں سے
اَعْظَمُ :(وہ) سب سے عظیم ہے
عِنْدَ اللّٰهِ :اللہ کے پاس
هُمُ الْفَآئِزُوْنَ :ہی کامیاب ہونے والے ہیں
رَبُّهُمْ :ان کا رب
مِّنْهُ :اپنے پاس سے
وَّجَنّٰتٍ :اور باغات کی
فِيْهَا :ان میں
خٰلِدِيْنَ :ایک حالت میں رہنے والے ہیں
اَبَدًا :ہمیشہ ہمیش
عِنْدَهٗٓ :اس کے پاس ہی
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ :اے لوگو جو
لَا تَتَّخِذُوْٓا :تم مت بناؤ
وَاِخْوَانَكُمْ :اور اپنے بھائیوں کو
اِنِ :اگر
الْكُفْرَ :کفر کو
وَمَنْ :اور جو

يَتَوَلَّهُمْ : دوستی کرے گا ان سے	مِّنْكُمْ : تم میں سے
فَاُولٰٓئِكَ : تو وہ لوگ	هُمُ الظّٰلِمُوْنَ : ہی ظلم کرنے والے ہیں
قُلْ : آپؐ کہہ دیجیے	اِنْ : اگر
كَانَ : ہیں	اٰبَآؤُكُمْ : تمہارے آباء واَجداد
وَاَبْنَآؤُكُمْ : اور تمہارے بیٹے	وَاِخْوَانُكُمْ : اور تمہارے بھائی
وَاَزْوَاجُكُمْ : اور تمہاری بیویاں	وَعَشِيْرَتُكُمْ : اور تمہارے رشتہ دار
وَاَمْوَالُ نِ : اور تمہارے وہ مال	اقْتَرَفْتُمُوْهَا : تم نے کمایا جن کو
وَتِجَارَةٌ : اور وہ تجارت	تَخْشَوْنَ : تم ڈرتے ہو
كَسَادَهَا : جس کی مندی سے	وَمَسٰكِنُ : اور وہ مکانات
تَرْضَوْنَهَآ : تم پسند کرتے ہو جن کو	اَحَبَّ : زیادہ پیارے ہیں
اِلَيْكُمْ : تمہارے لیے	مِّنَ اللّٰهِ : اللہ سے
وَرَسُوْلِهٖ : اور اس کے رسول سے	وَجِهَادٍ : اور جدوجہد کرنے سے
فِيْ سَبِيْلِهٖ : اس کی راہ میں	فَتَرَبَّصُوْا : تو انتظار کرو
حَتّٰى : یہاں تک کہ	يَاْتِيَ : لے آئے
اللّٰهُ : اللہ	بِاَمْرِهٖ : اپنا فیصلہ
وَاللّٰهُ : اور اللہ	لَا يَهْدِي : ہدایت نہیں دیتا
الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ : نافرمان لوگوں کو	

نوٹ: صحیح مسلم میں ہے کہ ایک دفعہ چند مسلمان آپس میں جھگڑ رہے تھے' ایک نے کہا کہ میرے نزدیک اسلام لانے کے بعد حاجیوں کو پانی پلانے سے زیادہ کوئی عبادت نہیں۔ دوسرے نے کہا کہ بہترین عمل مسجد حرام کی خدمت ہے۔ تیسرا بولا کہ جہاد فی سبیل اللہ سب سے افضل ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان کو ڈانٹا کہ تم جمعہ کے وقت منبر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھ کر بحث کر رہے ہو' ذرا صبر کرو' جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم فارغ ہو جائیں گے تو یہ چیز دریافت کر لی جائے گی۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا تو یہ آیات نازل ہوئیں (یعنی آیات ۱۹ تا ۲۲)۔ (ترجمہ شیخ الہندؒ)

سمجھنے والی بات یہ ہے کہ خدمت خلق اپنی جگہ ایک بڑی نیکی ہے۔ اس کی بلندترین منزل یہ ہے کہ اللہ کے مہمانوں یعنی حاجیوں کی خدمت کی جائے۔ اسی طرح کسی بھی مسجد کی خدمت کرنا بڑی نیکی کا کام ہے۔ اس کی بلندترین منزل مسجد حرام کی خدمت ہے۔ مذکورہ آیات میں ان میں سے کسی بھی نیکی کی نفی نہیں ہے۔ البتہ مختلف نیکیوں میں نسبت وتناسب کے لحاظ سے یہ بتایا گیا ہے کہ ان بلندترین نیکیوں کے مقابلہ میں بھی جہاد فی سبیل اللہ کی نیکی عظیم تر ہے۔

یہ درست ہے کہ کسی کی زندگی میں قتال فی سبیل اللہ کے بہت کم مواقع آتے ہیں' لیکن جہاد فی سبیل اللہ کے مواقع ہر شخص کی زندگی میں قدم قدم پر اس کے سامنے آتے رہتے ہیں۔ ایک متقی پرہیزگار انسان کے سامنے بھی معاملات میں ایسے مواقع آتے رہتے ہیں کہ جب اللہ رب العزت اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کسی لالچ کو ٹھکرائے بغیر یا کوئی نقصان برداشت کیے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔ یہ جہاد مع النفس کا لامتناہی سلسلہ ہے جو موت پر ہی ختم ہوتا ہے اور اسی کو رسول اللہ ﷺ نے افضل جہاد کہا ہے۔ اسی طرح اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق اسلام کی دعوت و تبلیغ اور نشر و اشاعت میں حصہ لینے کے مواقع کی کمی نہیں ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم جہاد فی سبیل اللہ کے صحیح مفہوم کو سمجھیں' پھر اس کی عظمت کو اپنے دل و دماغ پر نقش کریں۔

آیات ۲۵ تا ۲۹

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۝ ثُمَّ اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ الْكٰفِرِيْنَ ۝ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ اِنْ شَاۗءَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝

و ط ن

وَطَنَ يَطِنُ (ص) وَطْنًا : کسی جگہ اقامت کرنا' وطن بنانا۔

مَوْطِنٌ ج مَوَاطِنُ (مَفْعِلٌ کے وزن پر اسم الظرف): لیکن اصطلاحاً جنگ کے میدان کے لیے آتا ہے۔ زیر مطالعہ آیت ۲۵۔

ر ح ب

رَحُبَ يَرْحُبُ (ک) رُحْبًا : کسی جگہ کا کشادہ ہونا۔ زیر مطالعہ آیت ۲۵۔

مَرْحَبٌ (مَفْعَلٌ کے وزن پر اسم الظرف) : کشادگی کا وقت یا موقعہ۔ زیادہ تر خوش آمدید کے معنی میں آتا ہے۔ ﴿لَا مَرْحَبًا بِهِمْ ۭ﴾ (ص:۵۹) ''کوئی خوش آمدید نہیں ہے ان کے لیے۔''

ع ی ل

عَالَ يَعِيْلُ (ض) عَيْلًا : تنگ دست ہونا' محتاج ہونا۔

عَیْلَۃٌ (مصدر بھی ہے اور اسم ذات بھی): تنگ دستی۔ زیر مطالعہ آیت ۲۸۔

عَائِلٌ (فَاعِلٌ کے وزن پر صفت) : تنگ دست ہونے والا' یعنی تنگ دست۔ ﴿وَوَجَدَكَ عَائِلًا فَاَغْنٰى ۝۸﴾ (الضحیٰ) ''اور اس نے پایا آپؐ کو تنگ دست تو اس نے غنی کیا۔''

ع ط و

عَطَا یَعْطُوْا (ن) عَطْوًا : ہاتھ بڑھانا' لینا۔

اَعْطٰی (افعال) اِعْطَاءً : ہاتھ بڑھا کر دینا' خوش دلی سے دینا' حق سے زیادہ دینا' عطا کرنا' زیر مطالعہ آیت ۲۹۔

عَطَاءٌ (اسم ذات): عطیہ' بخشش۔ ﴿وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا ۝۲۰﴾ (الاسراء) ''اور نہیں ہے آپؐ کے رب کی بخشش روکی ہوئی۔''

تَعَاطٰی (تفاعل) تَعَاطِیًا : کسی کی طرف ہاتھ بڑھانا (لینے یا پکڑنے کے لیے)۔ ﴿فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطٰى فَعَقَرَ ۝۲۹﴾ (القمر) ''پھر انہوں نے پکارا اپنے ساتھی کو تو اس نے ہاتھ بڑھایا' پھر کاٹا۔''

ترکیب : (آیت ۲۸) ''اَلْمُشْرِكُوْنَ'' مبتدا ہے اور جمع ہے۔ اس کی خبر ''نَجَسٌ'' واحد آئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ''نَجَسٌ'' مصدر ہے اور مصدر کی جمع نہیں آتی۔ یہ واحد اور جمع کے لیے یکساں آتا ہے۔ (آیت ۲۹) ''قَاتِلُوْا'' کے بعد ''الَّذِیْنَ'' کی وضاحت ''لَا یُؤْمِنُوْنَ'' سے لے کر ''اُوْتُوا الْكِتٰبَ'' تک ہے۔ ''حَتّٰی'' کا تعلق ''قَاتِلُوْا'' سے ہے' یعنی جنگ کرو یہاں تک کہ......

ترجمہ:

لَقَدْ نَصَرَكُمُ : یقیناً مدد کر چکا ہے تمہاری	اللّٰهُ : اللہ
فِیْ مَوَاطِنَ كَثِیْرَةٍ : بہت سے جنگ کے میدانوں میں	وَّیَوْمَ حُنَیْنٍ : اور حنین کے دن (بھی)
اِذْ : جب	اَعْجَبَتْكُمْ : بھلی لگی تم کو
كَثْرَتُكُمْ : تمہاری کثرت	فَلَمْ تُغْنِ : تو وہ کام نہ آئی
عَنْكُمْ : تمہارے	شَیْئًا : کچھ بھی
وَّضَاقَتْ : اور تنگ ہوئی	عَلَیْكُمْ : تم پر
الْاَرْضُ : زمین	بِمَا : ساتھ اس کے جو
رَحُبَتْ : وہ کشادہ تھی	ثُمَّ : پھر
وَلَّیْتُمْ : تم نے پیٹھ پھیری	مُّدْبِرِیْنَ : پیٹھ دینے والا ہوتے ہوئے
ثُمَّ : پھر	اَنْزَلَ : اتاری

اللّٰہُ : اللہ نے
عَلٰی رَسُوْلِہٖ : اپنے رسولؐ پر
وَاَنْزَلَ : اور اس نے اتارے
لَّمْ تَرَوْھَا : تم نے نہیں دیکھا جن کو
الَّذِیْنَ : ان کو جنہوں نے
وَذٰلِكَ : اور یہ (ہی)
ثُمَّ : پھر
اللّٰہُ : اللہ
عَلٰی مَنْ : اس کی، جس کی
وَاللّٰہُ : اور اللہ
رَّحِیْمٌ : رحم کرنے والا ہے
اٰمَنُوْٓا : ایمان لائے
الْمُشْرِكُوْنَ : مشرک لوگ
فَلَا یَقْرَبُوا : پس وہ نزدیک مت ہوں
بَعْدَ عَامِھِمْ ھٰذَا : اپنے اس سال کے بعد
خِفْتُمْ : خوف ہو تم کو
فَسَوْفَ : تو عنقریب
اللّٰہُ : اللہ
اِنْ شَآءَ : اگر اس نے چاہا
عَلِیْمٌ : جاننے والا ہے
قَاتِلُوا : تم جنگ کرو
لَا یُؤْمِنُوْنَ : ایمان نہیں لاتے
وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ : اور نہ ہی آخری دن پر
مَا : اسے جس کو
اللّٰہُ : اللہ نے
وَلَا یَدِیْنُوْنَ : اور نہ ہی وہ ضابطۂ حیات بناتے ہیں

سَكِیْنَتَہٗ : اپنی سکینت
وَعَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ : اور مومنوں پر
جُنُوْدًا : ایسے لشکر
وَعَذَّبَ : اور اس نے عذاب دیا
كَفَرُوْا : کفر کیا
جَزَآءُ الْكٰفِرِیْنَ : کافروں کا بدلہ ہے
یَتُوْبُ : توبہ قبول کرے گا
مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ : اس کے بعد
یَّشَآءُ : وہ چاہے گا
غَفُوْرٌ : بخشنے والا ہے
یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ : اے لوگو جو
اِنَّمَا : کچھ نہیں سوائے اس کے کہ
نَجَسٌ : نجس ہیں
الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ : مسجد حرام کے
وَاِنْ : اور اگر
عَیْلَةً : تنگ دستی کا
یُغْنِیْكُمُ : غنی کر دے گا تم کو
مِنْ فَضْلِہٖٓ : اپنے فضل سے
اِنَّ اللّٰہَ : بے شک اللہ
حَكِیْمٌ : حکمت والا ہے
الَّذِیْنَ : ان سے جو
بِاللّٰہِ : اللہ پر
وَلَا یُحَرِّمُوْنَ : اور نہ وہ حرام ٹھہراتے ہیں
حَرَّمَ : حرام کیا
وَرَسُوْلُہٗ : اور اس کے رسولؐ نے
دِیْنَ الْحَقِّ : حق کے ضابطہ کو

(باقی صفحہ 78)

بیوی کے حقوق

(بسلسلہ اسلام میں عورت کا مقام اور میاں بیوی کے باہمی معاملات)

پروفیسر حافظ قاسم رضوان ☆

اسلام میں زوجین کے حقوق وفرائض باقاعدہ متعین کیے گئے ہیں، جن میں سے چند اہم کا ذکر درج ذیل ہے:

(۱) (حق) مہر

ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ﴾ (النساء:٤)

''اور عورتوں کے مہر خوش دلی سے ادا کرو۔''

﴿فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ؕ﴾ (النساء:٢٤)

''پھر جن کو تم کام میں لاؤ (زوجیت کی شرط کے ساتھ) ان عورتوں میں سے، تو ان کو دو ان کے حق (مہر) جو مقرر ہوئے۔''

﴿وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الْمُؤْمِنٰتِ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ﴾ (المائدۃ:٥)

''اور حلال کی گئی ہیں تمہارے لیے عزت دار عورتیں مؤمنوں میں سے اور عزت دار عورتیں ان لوگوں میں سے جن کے پاس تم سے پہلے کتاب بھیجی جا چکی، جبکہ تم ان کے مہر ادا کر دو۔''

نکاح کے وقت مرد اور عورت کے درمیان مہر کی ادائیگی کا جو اقرار اور عہد ہوا ہے، اسے پورا کرنا شوہر پر لازم ہے اور اس کی ادائیگی کی ذمہ داری اس پر ہے۔ اس سے سبکدوش اسی صورت ہوا جا سکتا ہے کہ بیوی یا تو اسے ایک متعین مدت تک مہلت دے یا اس کی ناداری کا لحاظ کرتے ہوئے قلبی رضامندی سے معاف کر دے اور یا پھر اس پر احسان کرتے ہوئے برضا و رغبت اپنے حق سے کُلّی یا جزئی دستبردار ہو جائے۔

﴿فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا ۝٤﴾ (النساء)

''پھر اگر وہ (ازواج) تم کو اس میں سے کچھ اپنی خوشی سے چھوڑ دیں تو اسے مزیدار اور خوشگوار سمجھ کر کھاؤ۔''

﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ؕ﴾ (النساء:٢٤)

☆ ریٹائرڈ صدر شعبہ اسلامیات ومطالعہ پاکستان، گورنمنٹ کالج آف کامرس، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور

''اور اگر تم (مہر) مقرر کرنے کے بعد اس میں کچھ کم زیادہ پر باہمی رضامندی سے کوئی تصفیہ کرلو تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔''

اسی طرح احادیث طیبہ بھی مہر کے حوالے سے واضح ہیں:

(ا) عَنْ اَبِیْ سَلَمَۃَ ؓ قَالَ: سَاَلْتُ عَائِشَۃَ زَوْجَ النَّبِیِّ ﷺ کَمْ کَانَ صَدَاقُ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ؟ قَالَتْ: کَانَ صَدَاقُہٗ لِاَزْوَاجِہٖ ثِنْتَیْ عَشْرَۃَ اُوْقِیَّۃً وَنَشًّا، قَالَتْ: اَتَدْرِیْ مَا النَّشُّ؟ قُلْتُ: لَا، قَالَتْ: نِصْفُ اُوْقِیَّۃٍ، فَتِلْکَ خَمْسُ مِائَۃِ دِرْھَمٍ (۱)

''حضرت ابوسلمہ ؓ کہتے ہیں کہ میں نے زوجۂ نبیؐ حضرت عائشہ ؓ سے دریافت کیا کہ آنحضرت ﷺ کا مہر (اپنی ازواج کے لیے) کتنا تھا؟ فرمایا کہ بارہ اوقیہ اور نش۔ پھر پوچھا کہ تم جانتے ہو کہ نش کیا ہے؟ میں نے کہا کہ نہیں۔ فرمایا: نصف اوقیہ اور یہ پانچ سو درہم ہوتے ہیں۔''

(ب) عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ ؓ قَالَ: اَلَا لَا تُغَالُوْا صَدُقَۃَ النِّسَاءِ، فَاِنَّھَا لَوْ کَانَتْ مُکْرُمَۃً فِی الدُّنْیَا اَوْ تَقْوٰی عِنْدَ اللّٰہِ لَکَانَ اَوْلَاکُمْ بِھَا نَبِیُّ اللّٰہِ ﷺ، مَا عَلِمْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ نَکَحَ شَیْئًا مِنْ نِسَائِہٖ وَلَا اَنْکَحَ شَیْئًا مِنْ بَنَاتِہٖ عَلٰی اَکْثَرَ مِنْ ثِنْتَیْ عَشْرَۃَ اُوْقِیَّۃً (۲)

''حضرت عمر بن خطاب ؓ سے روایت ہے کہ آپؓ نے فرمایا: دیکھو! عورتوں کے مہر زیادہ نہ بڑھایا کرو، کیونکہ اگر یہ دنیا میں عزت کا موجب اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک تقویٰ اور پرہیزگاری کی چیز ہوتی تو نبی کریم ﷺ تم سے زیادہ اس کے مستحق تھے۔ مجھے علم نہیں کہ نبی مکرم ﷺ نے اپنی ازواج مطہرات ؓ میں سے کسی سے بارہ اوقیہ سے زیادہ مہر پر نکاح کیا ہو، یا اپنی صاحب زادیوں میں سے کسی کا نکاح اس سے زیادہ مہر پر کیا ہو۔''

(ج) حضرت ابوہریرہ ؓ سے روایت ہے کہ حضور ﷺ کے زمانہ اقدس میں مہر دس اوقیہ تھا۔ (سنن النسائی)

بیوی کے حقوق میں سب سے اہم حق 'مہر' ہے جو کہ شوہر پر ادا کرنا لازم ہے اور اسی کی بنیاد پر مرد کو عورت پر حق زوجیت حاصل ہوتا ہے۔ مہر دراصل ایک اعزاز یہ ہے جو شوہر اپنی بیوی کو پیش کرتا ہے، جس کا مقصد عورت کا اعزاز و اکرام ہے۔ یہ نہ تو عورت کی قیمت ہے جسے ادا کر کے یہ سمجھا جائے کہ وہ شوہر کے ہاتھوں بک گئی اور اب اس کی حیثیت ایک کنیز کی سی ہے، اور نہ ہی یہ محض ایک فرضی کارروائی ہے، جس کے بارے میں یہ سمجھا جائے کہ اسے ادا کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ شوہر کے ذمے بیوی کے مہر کی ادائیگی لازم ٹھہرانے سے شریعت کا منشا یہ ہے کہ جب کوئی شوہر اپنی زوجہ کو گھر لائے تو اس کا اکرام کرتے ہوئے اسے ایک ایسا ہدیہ پیش کرے جو کہ اس کے مقام و مرتبہ کے مناسب ہو۔ لہٰذا شرعی تقاضا یہ ہے کہ مہر کی رقم نہ تو اتنی کم رکھی جائے جس میں اعزاز و اکرام کا یہ پہلو بالکل مفقود ہو اور نہ ہی اتنی زیادہ رکھی جائے کہ شوہر اسے ادا کرنے پر قادر ہی نہ ہو۔ آخر کار یا تو گناہ سمیٹتے ہوئے مہر ادا کیے بغیر دنیا سے رخصت ہو جائے یا پھر بیوی سے معافی کی بھیک مانگنے پر مجبور ہو جائے۔

شرعی لحاظ سے ہر عورت کا اصل حق یہ ہے کہ اسے 'مہر مثل' ادا کیا جائے۔ اس کا مطلب مہر کی وہ مقدار ہے جو اس عورت کے خاندان میں عام طور پر اس کی ہم مرتبہ خواتین کی مقرر کی جاتی رہی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ اگر نکاح کے وقت باہمی رضامندی سے مہر کا تعین نہ کیا گیا ہو یا مہر کا ذکر کیے بغیر نکاح ہو گیا ہو' تو شوہر کے ذمے مہر مثل کی ادائیگی خود بخود لازم ہو جاتی ہے۔ شرع اسلامی میں زیادہ سے زیادہ مہر کی حد باقاعدہ مقرر نہیں کی گئی (اگرچہ اپنی حد سے زیادہ مہر باندھنا پسندیدہ نہیں ٹھہرایا گیا) البتہ کم سے کم مہر کی حد فقہ حنفی کے مطابق دس درہم مقرر ہے (اس کا مطلب دو تولے' ساڑھے سات ماشے چاندی ہے)۔

مہر کی دو قسمیں 'مہر معجّل' اور 'مہر غیر معجّل یا مؤجل' مشہور ہیں۔ مہر معجّل وہ ہے جو کہ نکاح ہوتے ہی شوہر کے ذمے لازم ہو جاتا ہے اور ملاپ کے موقع پر اسے جلد از جلد ادا کر دینا چاہیے۔ مہر غیر معجّل یا مؤجل اسے کہا جاتا ہے جو کہ فوری ادا نہ کیا جائے اور اس کی ادائیگی کے لیے فریقین نے کوئی میعاد مقرر کر لی ہو' اسے عموماً 'عند الطّلب' بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن ہمارے معاشرے میں عام طور پر اس کے لیے کوئی تاریخ یا مدت مقرر نہیں کی جاتی اور سمجھا جاتا ہے کہ طلاق یا میاں بیوی میں سے کسی کے انتقال پر اس کی ادائیگی ہو گی' یہ غلط طریقہ کار ہے۔ مہر کا تعین محض ایک فرض یا رسمی کارروائی نہیں جو کہ بغیر سوچے سمجھے کر لی جائے' یہ ایک دینی فریضہ اور پوری سنجیدگی کا تقاضا کرتا ہے۔ یہ ایک باہمی معاملے کی بات اور حقوق العباد کا مسئلہ ہے۔ شرعاً اس کے تمام پہلو صاف اور واضح ہونے چاہئیں اور اس کے مطابق جلد از جلد ادا کرنا چاہیے۔

(۲) (نان و) نفقہ

ارشادِ ربانی ہے:

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ﴾ (النساء:۳۴)

''مرد عورتوں پر قوام ہیں' اس بنا پر کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر کہ وہ اپنے اموال خرچ کرتے ہیں۔''

اسلامی تعلیمات کی روشنی میں بیوی کا کام گھر میں خانگی فرائض سرانجام دینا ہے اور مرد کی ذمہ داری کمائی کرنا اور اپنے گھر والوں کے لیے ضروریاتِ زندگی فراہم کرنا ہے۔ ﴿وَبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ﴾ سے جس طرح وجوبِ مہر ثابت ہے' بالکل اسی طرح وجوبِ نفقہ کا اثبات بھی ہوتا ہے۔ اس کی اہمیت یہاں تک ہے کہ اگر شوہر یہ ذمہ داری ادا نہیں کر پاتا تو قانون اس کو یہ ذمہ داری ادا کرنے پر مجبور کرے گا' اور بصورتِ انکار یا عدمِ استطاعت اس کا نکاح فسخ کر دیا جائے گا' البتہ نفقہ کی مقدار کا تعین عورت کی خواہش پر نہیں' بلکہ مرد کی استطاعت پر ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ میں ایک کلیہ بیان کر دیا گیا ہے:

﴿عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ﴾ (البقرۃ:۲۳۶)

''مالدار پر اس کی استطاعت کے مطابق اور نادار پر اس کی استطاعت کے مطابق۔''

ایک صحابیؓ نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ ہماری بیویوں کا ہم پر کیا حق ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا: ''جب تم کھاؤ، انہیں بھی کھلاؤ اور جب تم پہنو انہیں بھی پہناؤ۔'' (مشکوٰۃ)

اس حوالے سے قرآن پاک میں ایک دوسری جگہ فرمایا گیا:

﴿لِيُنْفِقْ ذُوْ سَعَةٍ مِّنْ سَعَتِهٖ ۭ وَمَنْ قُدِرَ عَلَيْهِ رِزْقُهٗ فَلْيُنْفِقْ مِمَّآ اٰتٰىهُ اللّٰهُ ۭ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا مَآ اٰتٰىهَا ۭ﴾ (الطلاق:۷)

''جس کو گنجائش ہو اس کو چاہیے کہ اپنی گنجائش کے مطابق خرچ کرے، اور جس کی آمدنی نپی تلی ہو تو جتنا اللہ نے اسے دیا ہے، اس کے مطابق خرچ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے جس کو جتنا دیا ہے، اس سے زیادہ (کی) تکلیف کسی کو نہیں دیتا۔''

اسی طرح اولاد کے حوالے سے فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ﴾ (البقرۃ:۲۳۳)

''اور جس کا بچہ ہے، اس کے ذمے اس کا کھانا اور کپڑا قاعدہ کے مطابق ہے۔''

ارشادِ نبوی ﷺ ہے:

- ''تم (بیویوں) کے ساتھ کپڑا اور کھانا دینے میں خوش اخلاقی کا برتاؤ کرو۔'' (جامع ترمذی)
- ((اِذَا اَنْفَقَ الرَّجُلُ عَلٰى اَهْلِهٖ يَحْتَسِبُهَا فَهُوَ لَهٗ صَدَقَةٌ)) (۳)

''جب آدمی اپنے گھر والوں پر آخرت میں اجر پانے کی نیت سے خرچ کرتا ہے تو یہ اس کے لیے صدقہ بنتا ہے۔''

- ((دِيْنَارٌ اَنْفَقْتَهٗ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَدِيْنَارٌ اَنْفَقْتَهٗ فِيْ رَقَبَةٍ وَدِيْنَارٌ تَصَدَّقْتَ بِهٖ عَلٰى مِسْكِيْنٍ وَدِيْنَارٌ اَنْفَقْتَهٗ عَلٰى اَهْلِكَ، اَعْظَمُهَا اَجْرَ الَّذِيْ اَنْفَقْتَهٗ عَلٰى اَهْلِكَ)) (۴)

''ایک دینار تو وہ ہے جو تم نے جہاد کے سلسلہ میں خرچ کیا، ایک دینار وہ ہے جس سے غلام کو آزادی دلانے میں مدد دی، ایک دینار کسی غریب پر خرچ کیا اور ایک دینار اپنے بیوی بچوں پر خرچ کیا۔ ان سب سے اجر میں بڑھ کر وہ دینار ہے جو تم نے اپنے اہل وعیال پر خرچ کیا ہے۔''

- ''جو کچھ تم اپنی خورد ونوش پر خرچ کرو گے وہ بھی صدقہ ہے، جو اپنی اولاد کو کھلاؤ پلاؤ گے وہ بھی صدقہ ہے اور جو کچھ تم اپنی اہلیہ کو کھلاؤ گے وہ بھی صدقہ ہے۔'' (مستدرک حاکم)

البتہ یہ امر ملحوظِ خاطر رہے کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق ہر کام متوازن اور اعتدال کی حد میں ہونا چاہیے۔

فرمانِ نبویؐ ہے:

((خَيْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُهَا)) (۵)

''سب سے بہتر راستہ اعتدال کا راستہ ہے۔''

اسی طرح ارشادِ خداوندی ہے:

﴿وَلَا تَجْعَلْ يَدَكَ مَغْلُوْلَةً اِلٰى عُنُقِكَ وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ﴾ (بنی اسرائیل:۲۹)

''اور تم نہ تو اپنا ہاتھ اپنی گردن سے باندھ رکھو اور نہ ہی اسے بالکل کھلا چھوڑ دو۔''

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اعتدال کے پہلو کو یوں قائم رکھا کہ اہل وعیال اور دیگر پر خرچ تو کھلے دل سے کرتے' البتہ گھر کی آرائش وزیبائش اور لباس کے معاملے میں احتیاط کا دامن تھامے رکھتے۔

شوہر کو پوری فراخ دلی کے ساتھ اہلیہ کی ضروریات کا دھیان رکھنا چاہیے اور اسے خرچ میں تنگی کا احساس نہیں ہونا چاہیے۔ اپنی محنت کی کمائی گھر والوں پر خرچ کر کے شوہر راحت حاصل کرے۔ کھانا' کپڑا بیوی بچوں کا حق ہے اور اس حق کو خوش دلی اور کشادگی کے ساتھ ادا کرنے کے لیے اپنی استطاعت کے مطابق دوڑ دھوپ اور محنت کرنا شوہر کا خوشگوار فریضہ ہے۔ اس فریضے کو کھلے دل سے انجام دینے سے نہ صرف دنیا میں خوشگوار ازدواجی زندگی کی نعمت ملتی ہے' بلکہ وہ مؤمن شوہر آخرت میں بھی اجر وثواب کا مستحق ٹھہرتا ہے۔

بعض اوقات شوہر اپنے والدین کی ہدایت پر کُلّی عمل کرتے ہوئے کہ بیوی فضول خرچ اور پھوہڑ ہے' گھر کے مناسب اخراجات سے بھی ہاتھ کھینچ لیتا ہے۔ یہ بات مکمل طور پر قابل اصلاح ہے۔ ہمارے بزرگوں اور والدین کے زمانے میں گھر کے اخراجات کے لیے جو رقم خرچ ہوتی تھی' آج کل ہم اس کا سوچ بھی نہیں سکتے۔ آمدنی میں ترقی کے ساتھ بے پناہ مہنگائی کے ہاتھوں اخراجات میں بھی زبردست اضافہ ہوا ہے۔ رہن سہن کے طور طریقوں میں جو روز بروز تبدیلی آ رہی ہے' اس کا چالیس' پچاس سال پہلے گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ کل جو اشیاء آسائش کے زمرہ میں آتی تھیں' وہ آج ناگزیر ضروریات بن کر رہ گئی ہیں۔ لیکن وہ والدین جنہوں نے حالات و واقعات سے سمجھوتہ نہیں کیا' وہ ایسے اخراجات کو اپنی بہو کے گھریلو مصارف کے حوالے سے انتہائی فضول خرچی گردانتے ہیں۔ یوں گھریلو ماحول میں خواہ مخواہ کشیدگی کا باعث بنتے ہیں۔ ایک اچھے شوہر پر والدین کی جسمانی اور مالی خدمت کے ساتھ ساتھ بیوی بچوں کا نان ونفقہ اپنی حیثیت کے مطابق ادا کرنا ایک لازمی امر ہے۔ شریعت اسلامی شوہر کو اس بات کی بالکل اجازت نہیں دیتی کہ وہ والدین کے ایسے احکام مانے' جن سے بیوی کے حقوق کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا 'نظم نفقہ' کے ضمن میں درج ذیل دستور تھا:

اَنَّ النَّبِیَّ صلی اللہ علیہ وسلم كَانَ يَبِيْعُ نَخْلَ بَنِى النَّضِيْرِ وَيَحْبِسُ لِاَهْلِهٖ قُوْتَ سَنَتِهِمْ (٤)

''نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بنی نضیر کے باغ کو فروخت فرما دیا کرتے تھے اور اس کی قیمت اپنے اہل وعیال کے سال بھر کے نفقہ کے لیے جمع فرما لیتے۔''

فقہاء نے نفقہ کی ادائیگی کو واجب کہا ہے' اور بیوی مالدار ہو یا غریب' اسے نفقہ کی ادائیگی کا کہا ہے۔ شریعت میں کھانا' کپڑا کے ساتھ نفقہ میں جائے سکونت بھی لازمی ہے:

هی لغة ما ينفقه الانسان على عياله وشرعًا هی الطعام والكسوة والسُّكنٰى (در مختار)

''لغت میں نفقہ اس چیز کو کہتے ہیں جو آدمی اپنے بال بچوں پر خرچ کرتا رہے اور شریعت میں نفقہ کھانا' کپڑا

اور مکان کا نام ہے۔''

نان ونفقہ دینے کے حوالے سے اگر خاوند بخیل ہو تو حدیثِ رسولؐ کی روشنی میں ہمیں درج ذیل رہنمائی ملتی ہے۔ حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہ کی بیوی ہندہ کا واقعہ مشہور ہے کہ وہ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں' اپنا شکوہ پیش کیا کہ میرے خاوند بخیلی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور اتنا نفقہ مجھے ادا نہیں کرتے' جو میری اور بچوں کی ضروریات کو پورا کر سکے۔ ساری روئیداد سنا کر انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ اگر میں ان کے مال سے بال بچوں کو کھلاؤں تو کیا اس میں کوئی حرج ہے؟ ارشاد نبویؐ ہوا:

((خُذِیْ مَا یَکْفِیْكِ وَوَلَدَكِ بِالْمَعْرُوْفِ)) (۷)

''اتنا لے لو جو تمہیں اور تمہارے بال بچوں کے لیے کافی ہو۔''

(۳) ظلم سے اجتناب

شوہر کو بیوی پر جو ترجیحی حقوق اور اختیارات اسلامی شریعت نے دیے ہیں' ان کا کسی بھی طور پر ظالمانہ طریقے سے استعمال بالکل نہیں ہونا چاہیے۔ ناانصافی کی درج ذیل صورتیں ممکن ہیں:

(ا) ضرار اور تعدی: شوہر کو عورت سے رغبت نہ ہو' اس کو رکھنا نہ چاہے' مگر محض ستانے اور زیادتی کرنے کے لیے رکھ چھوڑے' بار بار طلاق دے اور دو طلاقوں کے بعد تیسری طلاق سے پہلے اس سے رجوع کر لے وغیرہ۔ قرآن پاک میں ایسے رویے سے نہایت سختی کے ساتھ منع کیا گیا ہے کہ یہ بھی ظلم ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

﴿وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۭ وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۠﴾ (البقرۃ:۲۳۱)

''اور انہیں (عورتوں کو) تکلیف پہنچانے کی غرض سے ظلم و زیادتی کے لیے نہ روکو۔ جو شخص ایسا کرے اس نے اپنی جان پر ظلم کیا۔ اور تم اللہ کے احکام کو ہنسی کھیل نہ بناؤ۔''

اس آیت میں ارشاد فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی آیات (احکامات) کو کھیل نہ بناؤ۔ اس کی ایک تفسیر تو یہ ہے کہ نکاح وطلاق کے لیے اللہ تعالیٰ نے جو حدود و شروط مقرر کر دیے ہیں' ان کی خلاف ورزی نہ کرنا۔ دوسری تفسیر حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ زمانہ جاہلیت میں بعض لوگ طلاق دے کر یا غلام آزاد کر کے مکر جاتے' اور کہتے کہ میں نے تو ہنسی مذاق میں کہہ دیا تھا' طلاق یا عتاق کی نیت نہیں تھی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی' جس نے یہ فیصلہ کر دیا کہ طلاق و نکاح کو اگر کسی نے کھیل یا مذاق میں بھی کہہ دیا اور پورا کر دیا تو وہ نافذ ہو جائیں گے' نیت نہ کرنے کا عذر مسموع اور قابلِ قبول نہیں ہوگا۔ حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں جنہیں ہنسی مذاق کے طور پر کرنا یا واقعی طور پر کرنا دونوں برابر ہیں' ایک طلاق' دوسرے عتاق' تیسرے نکاح۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اس حدیث میں یہ الفاظ منقول ہیں: ''تین چیزیں ایسی ہیں جن کو قصد و ارادہ سے کہنا اور ہنسی مذاق کے طور پر کہنا برابر ہے' ایک نکاح' دوسرے طلاق' تیسرے رجعت''۔ ان تینوں صورتوں میں حکم شرعی یہ

ہے کہ مرد وعورت اگر نکاح کا ارادہ کیے بغیر ہنسی مذاق میں گواہوں کے سامنے ایجاب وقبول کر لیں، تو بھی نکاح منعقد ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر شوہر قصداً نہیں، صرف ہنسی مذاق میں صریحاً طلاق دے دے، تو بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے، یا رجوع کر لے تو بھی رجعت واقع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اگر آقا اپنے کسی غلام کو ہنسی مذاق میں آزاد کر دینے کا کہہ دے، تو وہ غلام یا باندی آزاد ہو جاتی ہے۔ (۸)

اس آیت میں مردوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ جب وہ اپنی بیویوں کو طلاق رجعی دیں اور ان کی عدت ختم ہونے کے قریب پہنچ جائے، پھر یا تو رجوع کر کے انہیں عمدگی کے ساتھ گھر میں بسا لیں یا پھر انہیں عمدگی کے ساتھ بغیر جھگڑے اور بدزبانی کے چھوڑ دیں۔ طلاق کے اس دستور کو اسلام نے ختم کر دیا کہ طلاق دی اور عدت ختم ہونے کے قریب رجوع کر لیا، پھر طلاق دی اور آخر میں رجوع کر لیا۔ یونہی اس مصیبت زدہ عورت کی عمر برباد کرتے رہے، نہ وہ سہاگن رہتی اور نہ ہی خاوند سے آزاد ہوتی۔ تو اس سے اللہ عزوجل نے روکا اور فرمایا کہ ایسا کرنے والا ظالم ہے، اور پھر ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو ہنسی مذاق نہ بناؤ۔

اسی طرح سنن نسائی میں ہے کہ حضور پاک ﷺ کو ایک مرتبہ یہ معلوم ہوا کہ کسی شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں ایک ساتھ (اکٹھی) دی ہیں تو آپؐ سخت غضب ناک ہو کر کھڑے ہوئے اور فرمانے لگے کہ کیا میری موجودگی میں کتاب اللہ (کے احکامات) کے ساتھ کھیلتے ہو؟ (۹)

﴿وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا﴾ ''اللہ تعالیٰ کی آیات کا مذاق نہ بنالو'' سے مراد ہے کہ قانون کے الفاظ سے ایسا ناجائز فائدہ اٹھانا جو قانون کے مقصد اور اس کی روح کے خلاف ہو۔ یہی دراصل قانون سے کھیلنا اور اس کا مذاق بنانا ہے۔ قرآن پاک میں مرد کو ایک طلاق یا دو طلاق دے کر رجوع کر لینے کا جو حق دیا گیا ہے، وہ صرف اس غرض کے لیے ہے کہ اگر اس دوران زوجین کے درمیان مصالحت ہو جائے اور ان کے باہم مل جل کر رہنے کی کوئی صورت نکل آئے، تو شریعت کی طرف سے اس میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ لیکن اگر کوئی شخص اس گنجائش سے فائدہ اٹھا کر طلاق دے، پھر عدت گزر جانے سے پہلے رجوع کر لے، پھر طلاق دے اور پھر رجوع کر لے، اور اس حرکت سے اس کی غرض یہ ہو کہ عورت کو خواہ مخواہ لٹکائے رکھے، نہ خود اپنے گھر میں بسائے اور نہ ہی اسے آزاد کرے کہ وہ کہیں اور نکاح کر سکے، تو پھر یہ خدا کے قانون سے مسخرہ پن، مذاق اور کھیل ہے، جس کی جرأت کوئی سچا مؤمن کبھی نہیں کر سکتا۔ (۱۰)

(ب) ازواج میں عدل نہ کرنا: ایک سے زیادہ بیویاں ہونے کی صورت میں باہمی عدل نہ کر پانا اور کسی ایک کی طرف مائل ہو کر دوسری بیوی یا بیویوں کو معلق رکھ چھوڑنا، یہ بھی ظلم اور قرآن کی رو سے قطعاً ممنوع ہے۔ سورۃ النساء میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝۳﴾

''پس عورتوں میں سے جو بھی تمہیں اچھی لگیں تم ان سے نکاح کرلو' دو دو' تین تین اور چار چار سے' لیکن اگر تمہیں برابری (عدل) نہ کر سکنے کا خوف ہو تو (پھر) ایک ہی کافی ہے' یا تمہاری ملکیت کی لونڈی۔ یہ زیادہ قریب ہے کہ (ایسا کرنے سے ناانصافی اور) ایک طرف جھک جانے سے بچ جاؤ۔''

آیت میں مَاطَابَ کا لفظ آیا ہے۔ حسن بصری' ابن جبیر اور مالک ؒ نے اس کی تفسیر مَاحَلَّ (جو عورتیں تمہارے لیے حلال ہیں) سے فرمائی ہے۔ بعض حضرات نے مَا طَابَ کے لفظی معنی کے لحاظ سے 'پسندیدہ' کا ترجمہ کیا ہے' مگر ان دونوں میں کوئی تضاد نہیں۔ اسے یوں مراد لیا جا سکتا ہے کہ جو عورتیں طبعی طور پر تمہیں پسند ہوں اور تمہارے لیے شرعاً حلال بھی ہوں۔

اس آیت میں ایک طرف تو اس بات کی اجازت دی گئی ہے کہ ایک سے زائد دو' تین اور چار عورتیں بھی اپنے نکاح میں جمع کر سکتے ہو' دوسری طرف چار کے عدد تک پہنچا کر یہ پابندی بھی عائد کر دی گئی کہ چار سے زائد عورتیں بیک وقت مرد کے نکاح میں جمع نہیں کی جا سکتیں۔ رسول پاک ﷺ کے بیان نے اس قرآنی تخصیص اور پابندی کو اور زیادہ واضح کر دیا۔ اس آیت کے نزول کے بعد ایک شخص غیلان بن اسلمہ ثقفی ؓ مسلمان ہوئے۔ اس وقت ان کے نکاح میں دس عورتیں تھیں اور وہ سب بھی مسلمان ہو گئیں۔ حضور اکرم ﷺ نے حکم قرآنی کے مطابق انہیں حکم دیا کہ ان دس میں سے چار کو منتخب کر لیں' باقی عورتوں کو طلاق دے کر آزاد کر دیں۔ چنانچہ حضرت غیلان نے چار عورتوں کو رکھ کر باقی سب سے علیحدگی اختیار کر لی۔ (ترمذی و ابن ماجہ)

اس سے آیت قرآنی کی مراد بالکل واضح ہو گئی کہ چار سے زائد عورتوں کو بیک وقت نکاح میں جمع کرنا بالکل حرام ہے۔ چار بیویوں کی اجازت دے کر یہ بھی ارشاد فرمایا کہ: ﴿فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً﴾ یعنی اگر تمہیں اس بات کا خوف ہو کہ (ان میں باہمی) عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی (بیوی) پر اکتفا کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک سے زائد نکاح کرنا اسی صورت میں جائز اور مناسب ہے' جبکہ شریعت کے منشا کے مطابق ان سب بیویوں میں عدل اور برابری کر سکو اور سب کے حقوق کا لحاظ کر سکو۔ اگر اس سب پر قدرت نہیں رکھتے تو پھر ایک ہی بیوی کو اپنے نکاح میں رکھا جائے۔

زمانۂ جاہلیت میں یہی ظلم عام تھا کہ ایک شخص کئی کئی بیویاں رکھ لیتا اور ان کے حقوق میں مساوات اور عدل کا بالکل خیال نہ کرتا۔ جس کی طرف زیادہ قلبی میلان ہو گیا' اس کو ہر طرح سے نوازنے اور خوش کرنے کی فکر میں لگ گئے اور دوسری بیویوں کے حقوق کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے رہے۔ اس پس منظر میں قرآن نے صاف صاف فرما دیا کہ اگر ان کے درمیان عدل نہ کر سکو تو پھر ایک ہی رکھو۔

اللہ تعالیٰ نے اگرچہ چار بیویاں بیک وقت نکاح میں رکھنے کی اجازت دی ہے' چار کی حد سے آگے بڑھنا حرام ہے' لیکن شریعت کی تعلیم کے مطابق ان میں عدل و مساوات قائم رکھنا واجب ہے اور اس کے خلاف کرنا گناہ عظیم ہے۔ جب ایک سے زائد نکاح کرنے کا ارادہ ہو تو پہلے اپنے حالات کا جائزہ لینا چاہیے کہ ان

سب کے حقوق عدل ومساوات کے ساتھ ادا کرنے کی قدرت اور صلاحیت ہے بھی یا نہیں؟ اگر یہ احتمال غالب ہو کہ ان میں برابری اور عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک سے زائد نکاح کرنا اپنے آپ کو گناہ عظیم میں مبتلا کرنے کے مترادف ہے۔ ایسی صورت میں اس حماقت اور گناہ سے باز رہنا اور ایک ہی بیوی پر قناعت کرنی چاہیے۔

حدیثِ نبویؐ ہے: ''جس شخص کے نکاح میں دو عورتیں ہوں اور وہ ان کے حقوق میں برابری اور انصاف نہ کر سکے تو وہ قیامت میں اس طرح اٹھایا جائے گا کہ اس کا ایک پہلو گرا ہوا ہوگا۔'' (مشکوٰۃ)

یہاں یہ بات ذہن نشین رہے کہ یہ عدل اور مساوات ان امور میں ضروری ہے جو کہ انسان کے اختیار میں ہیں، جیسے نفقہ اور شب باشی میں برابری وغیرہ۔ رہے وہ کام جو کہ انسان کے اختیار میں ہی نہیں، جیسے قلب کا میلان اور ذہن کا رجحان وغیرہ، تو اس غیر اختیاری معاملہ پر انسان پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ اس دلی محبت اور میلان کا اثر اختیاری معاملات پر بالکل نہ پڑے۔ اس حوالے سے قرآن کریم کی ایک دوسری آیت میں ارشاد ہوتا ہے: ﴿وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ﴾ (النساء: ۱۲۹) ''اور عورتوں (بیویوں) کے درمیان تم پوری برابری ہرگز نہ کر سکو گے۔''

یہاں اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ محبت اور قلبی رجحان ایک غیر اختیاری معاملہ ہے، جس میں برابری کر سکنا انسان کے بس میں نہیں۔ لیکن اسی آیت میں آگے اس غیر اختیاری معاملات کی اصلاح کے لیے ارشاد فرمایا گیا: ﴿فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ﴾ (النساء: ۱۲۹) ''کسی ایک (بیوی) کی طرف بالکل نہ جھک پڑو کہ دوسری کو گویا معلّق رکھ چھوڑو''۔ یعنی اگر تمہیں کسی ایک بیوی سے زیادہ محبت ہو، اب اس میں تو تم معذور ہو، لیکن دوسری بیوی سے کُلّی بے توجہی اور بے مروتی اس حالت میں بھی جائز نہیں۔ اب مذکورہ بالا آیت کے جملے ﴿فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً﴾ میں جس عدل ومساوات کا بیان ہے، یہ وہی امور اختیاریہ (ادائے حقوق واجب) کا عدل ہے، جس میں بے اعتدالی اور لاپروائی گناہ عظیم ہے۔ اور جس شخص کو اس گناہ میں ملوث ہونے کا خطرہ ہو، اسی کو یہ ہدایت اور تنبیہ کی گئی ہے کہ ایک سے زائد نکاح نہ کرے۔

آیت کے اختتام پر فرمانِ الٰہی ہے: ﴿ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝۳﴾ اس آیت میں دو کلمے ہیں: ایک کلمہ ادنیٰ، یہ لفظ دُنُوٌّ سے مشتق ہے، جو قرب کے معنی میں ہے، اور دوسرا لفظ لَا تَعُوْلُوْا ہے۔ عَالَ یَعُوْلُ، مَالَ یَمِیْلُ کے معنی میں ہے، جس کا مطلب میلان ہے، اور یہاں ناجائز میلان اور ظلم وجور کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ گویا مقصد یہ ہے کہ اس آیت میں جو کچھ تمہیں بتایا گیا ہے (یعنی عدل نہ کر سکنے کی صورت میں ایک ہی بیوی پر اکتفا کرنا)، یہ ایسی چیز ہے کہ جس کو اختیار کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے سے تم ظلم کرنے سے بچ سکو گے اور زیادتی وتعدی کے مواقع ختم ہو سکیں گے۔

یہاں ایک شبہ یہ ہے کہ جب بیوی ایک ہی ہوگی تو بالکل ظلم کا کوئی موقع نہ ہوگا۔ پھر لفظ ادنیٰ بڑھا کر یہ کیوں فرمایا کہ اس پر عمل پیرا ہونا اس بات کے قریب ہے کہ تم ظلم نہ کرو، بلکہ یہ فرمانا چاہیے کہ تم مکمل طور پر اس ظلم

سے بچ جاؤ گے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ لفظ ادنیٰ بڑھا کر اس طرف اشارہ فرمایا گیا ہے کہ چونکہ بہت سے لوگ ایک بیوی کو بھی ظلم وستم کا تختہ بنائے رکھتے ہیں' اس لیے ظلم کا مکمل راستہ بند کرنے کے لیے صرف یہ کافی نہیں کہ ایک سے زائد نکاح نہ کرو۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس صورت میں ظلم کا خطرہ کم ہو جائے گا اور تم عدل کے قریب پہنچ جاؤ گے۔ اب ظلم وستم سے پورے طور پر رہائی اسی وقت ہوگی جبکہ ایک بیوی کے حقوق پورے ادا کیے جائیں' اس کے ساتھ حسن سلوک کا معاملہ رکھا جائے' نیز اس کی خامیوں سے درگزر اور اس کی کجی پر صبر کیا جائے۔ (۱۱)

ایک سے زائد بیویاں ہونے کی صورت میں شوہر کا ان کے درمیان عدل نہ کرنا اور کسی ایک کی طرف مائل ہو کر دوسری بیوی یا بیویوں کو معلق رکھ چھوڑنا' یہ بھی ظلم اور قرآن کی رو سے ممنوع ہے۔ فرمانِ الٰہی ہے: ﴿فَلَا تَمِيْلُوْا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوْهَا كَالْمُعَلَّقَةِ﴾ (النساء:۱۲۹) ''کسی ایک کی طرف بالکل نہ جھک پڑو کہ دوسری کو گویا معلق (یکسر نظر انداز) رکھ چھوڑو۔''

قرآن کریم میں تعددِ ازواج کی اجازت عدل کی شرط سے مشروط ہے۔ اگر عدل نہ ہو تو اجازت خود بخود منسوخ ہو جاتی ہے' اذا فات الشرط فات المشروط۔ خود اس آیت میں جہاں تعددِ ازواج کی اجازت دی گئی ہے' وہاں صاف حکم موجود ہے کہ اگر تم عدل نہ کر سکو تو ایک ہی بیوی رکھو۔ ارشادِ خداوندی ہے: ﴿فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَعُوْلُوْا ۝۳﴾ (النساء:۳) ''پھر اگر تم کو خوف ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی بیوی رکھو یا (پھر) لونڈی جو تمہاری ملکیت میں ہو' یہ زیادہ قرین مصلحت ہے تاکہ تم حق سے متجاوز نہ ہو جاؤ۔''

امام شافعیؒ نے ''اَلَّا تَعُوْلُوْا'' کے معنی یہ کیے ہیں کہ تمہارے عیال زیادہ نہ ہوں' جن کی پرورش کا بار تم پر پڑ جائے' لیکن یہ اہلِ لغت کے خلاف ہے' اس لیے کہ لغت میں عول کے معنی میل کے ہیں۔ ابو طالب کا شعر ہے:

بمیزان صدقٍ لا یخسُّ شعیرة ووزّان قِسطٍ وزنه غیر عائل

یہاں عائل بمعنی مائل مستعمل ہوا ہے' اسی اصل سے عول کو جور اور طریق عدل سے ہٹ جانے کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباسؓ' حسن' مجاہد' شعبی' عکرمہ اور قتادہ وغیرہ نے 'لا تعولوا' کے معنی 'لا تمیلوا عن الحق' کیے ہیں۔ قرآن پاک کی مذکورہ بالا آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ جو شخص دو یا اس سے زائد بیویوں کے درمیان عدل نہیں کرتا اور ایک کی طرف جھک کر دوسری یا دوسروں کے حقوق ادا کرنے میں کوتاہی کرتا ہے' وہ ظالم ہے' تعددِ ازواج کی اجازت سے فائدہ اٹھانے کا اسے کوئی حق نہیں۔ ایسی حالت میں قانون اسے صرف ایک بیوی رکھنے پر مجبور کرے گا اور دوسری بیوی یا بیویوں کو اس کے خلاف قانون سے دادرسی پانے کا حق ہوگا۔

عدل کے حوالے سے قرآن پاک نے تصریح کر دی ہے کہ جہاں تک دلی محبت اور قلبی میلان کا تعلق ہے' اس میں مساوات برتنے پر نہ تو انسان قادر ہے اور نہ ہی اس کے لیے وہ مکلف ہے' بفحوائے آیت قرآنی: ﴿وَلَنْ تَسْتَطِيْعُوْٓا اَنْ تَعْدِلُوْا بَيْنَ النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ﴾ (النساء:۱۲۹) ''اور تم ہرگز برابر نہ رکھ سکو گے عورتوں کو'

اگر چہ اس کی حرص کرو‘‘ البتہ اس کو تکلیف جس بات کی دی گئی ہے‘ وہ یہ ہے کہ نفقہ‘ معاشرت اور تعلقاتِ زن وشو میں ان (بیویوں) کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے۔ (۱۲)

(ج) ایلاء: اس بارے میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۲۷﴾﴾ (البقرۃ)

’’جو لوگ اپنی عورتوں کے پاس جانے سے قسم کھا لیتے ہیں‘ ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے‘ پس اگر وہ رجوع کر لیں تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے‘ اور اگر طلاق کا ہی قصد کر لیں تو اللہ تعالیٰ سننے والا‘ جاننے والا ہے۔‘‘

ایلاء کے معنی قسم کھانے کے ہیں‘ یعنی اگر کوئی شوہر قسم کھا لے کہ میں اپنی بیوی سے صحبت نہیں کروں گا‘ تو اس کی ممکنہ چار صورتیں ہیں: (۱) شوہر کسی مدت کا تعین نہ کرے (۲) چار مہینے کی قید لگا دی جائے (۳) چار مہینے سے زیادہ مدت کی قید لگا دے اور (۴) چار مہینے سے کم مدت کا تعین کرے۔ پس صورت اول‘ دوم اور سوم کو شریعت میں ایلاء کہتے ہیں‘ اور اس کا حکم یہ ہے کہ اگر چار ماہ کے اندر اپنی قسم توڑ ڈالے اور بیوی سے صحبت کر لے‘ تو قسم کا کفارہ ادا کرے اور نکاح باقی رہے گا۔ اگر چار مہینے گزر گئے اور شوہر نے اپنی قسم نہ توڑی تو اس کی زوجہ پر قطعی طلاق (طلاق بائنہ) ہو گئی‘ اب بلا نکاح رجوع کرنا درست نہیں رہا۔ یعنی دونوں باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کر لیں تو بالکل درست ہو گا۔ صورت چہارم کا حکم یہ ہے کہ اگر قسم توڑے تو کفارہ لازم ہے‘ اور اگر قسم پوری کرے‘ تب بھی نکاح باقی ہے۔ (۱۳)

کوئی شوہر اگر قسم کھا لے کہ میں اپنی بیوی سے (مثلاً) ایک مہینہ یا دو مہینے ازدواجی تعلق نہیں رکھوں گا‘ پھر قسم کی مدت پوری کر کے تعلق قائم کر لیتا ہے تو اس پر کوئی کفارہ نہیں‘ البتہ اگر مدت پوری ہونے سے قبل تعلق قائم کرے گا تو پھر اسے کفارۂ قسم ادا کرنا ہو گا۔ اگر چار مہینے سے زیادہ مدت کے لیے یا مدت کے تعین کے بغیر شوہر قسم کھاتا ہے‘ تو اس آیت میں ایسے لوگوں کے لیے مدت کا تعین کر دیا گیا ہے کہ وہ چار مہینے گزرنے کے بعد یا تو بیوی سے تعلق قائم کر لیں یا پھر اسے طلاق دے دیں (شوہر کو اپنی بیوی کو چار مہینے سے زیادہ معلق رکھنے کی شرعی اجازت نہیں ہے)‘ البتہ تعلق قائم رکھنے کی صورت میں اسے کفارۂ قسم ادا کرنا ہو گا۔ اگر شوہر ان دونوں میں سے کوئی صورت اختیار نہیں کرتا تو عدالت اس کو دونوں میں سے کسی ایک بات کے اختیار کرنے پر مجبور کرے گی کہ وہ بیوی سے (ازدواجی) تعلق قائم کرے‘ یا پھر اسے طلاق دے تاکہ عورت پر ظلم نہ ہو۔ (جمہور کا موقف یہی ہے کہ چار مہینے عدم تعلق کے گزر جائیں تو از خود طلاق واقع ہو جائے گی‘ البتہ اس کے رجعی یا بائن ہونے میں علمی اختلاف ہے۔) (۱۴)

عورت کے داعیاتِ نفس کو پورا کرنے سے کسی عذر جائز اور شرعی کے بغیر اعراض کرنا‘ جس کا مقصد محض اس کو سزا دینا اور تکلیف پہنچانا ہو‘ اس کے لیے اسلامی قانون کی زیادہ سے زیادہ چار مہینے کی مدت رکھی گئی ہے۔

اس مدت کے اندر شوہر پر لازم ہے کہ اپنی بیوی سے تعلقاتِ زن وشو پیدا کر لے‘ ورنہ مدت کے ختم ہونے پر اس کو مجبور کر دیا جائے گا کہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر چھوڑ دے۔ (عذر جائز سے مراد مرد یا عورت کی بیماری‘ یا مرد کا طویل حالتِ سفر میں ہونا‘ یا کوئی ایسی صورت پیش آ جانا ہے جس میں شوہر اپنی بیوی کی طرف رغبت تو رکھتا ہو مگر اس کے پاس جانے (مقاربت) پر قادر نہ ہو۔)

مسئلہ ایلاء میں بعض فقہاء نے حلف کی شرط لگائی ہے‘ یعنی اگر شوہر نے اپنی بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی ہے‘ تو ایلاء ہوگا‘ لیکن اگر اس نے قسم نہیں کھائی تو خواہ وہ دس برس بیوی سے علیحدہ رہے‘ اس پر حکم ایلاء کا اطلاق نہیں ہوگا۔ لیکن یہ امر متنازعہ ہے۔ اسلامی قانون کا اصل الاصول یہ ہے کہ ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا﴾ یعنی کسی شخص کو اس کی برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جا سکتی۔ اس قاعدۂ کلیہ کے تحت ایلاء کے ضمن میں قرآن پاک نے عورت کی فطری قوتِ برداشت کا لحاظ کیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اگر کسی سزا کے طور پر عورت کو شوہر کی صحبت سے محروم کیا جائے‘ تو یہ صرف اتنی مدت کے لیے ہونی چاہیے جس کو وہ برداشت کر سکے۔ اس عرصے سے زیادہ سزا دینے میں تکلیف مالایطاق ہے۔ نیز اس بات کا بھی اندیشہ ہے کہ کہیں عورت کسی اخلاقی فتنے میں بھی مبتلا نہ ہو جائے‘ جس سے عورت کو محفوظ رکھنا قانونِ اسلامی کا اولین مقصد ہے۔ پس آیت مذکورہ کا اصل مدعا یہ ہے کہ عورت کو سزا کے طور پر ترکِ صحبت کی تکلیف چار مہینے کی مدت سے زیادہ کے لیے نہ دی جائے۔ رہا قسم کھانا یا نہ کھانا‘ تو یہ اس مسئلہ میں کوئی حقیقی اہمیت نہیں رکھتا‘ اس لیے کہ قسم نہ کھانے سے عورت کی تکلیف میں کوئی کمی نہیں ہوتی اور قسم کھا لینے سے اس میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اس باب میں حضرت علیؓ‘ حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور امام مالک نیز امام احمد کی رائے یہی ہے کہ ضرار کی نیت سے عورت کو چھوڑنا ایلاء ہے‘ خواہ قسم کھائی گئی ہو یا نہ کھائی گئی ہو۔

﴿وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ﴾ کی تفسیر میں بھی اختلاف رہا ہے۔ حضرت عثمانؓ‘ حضرت زید بن ثابتؓ‘ حضرت ابن مسعود اور حضرت ابن عباسؓ کی رائے میں چار مہینے کی مدت کا گزر جانا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ شوہر نے طلاق کا عزم اور ارادہ کر لیا ہے‘ لہٰذا اس مدت کے ختم ہونے پر اس کو رجوع کرنے کا حق باقی نہیں رہتا۔ حضرت علی اور حضرت ابن عمرؓ سے بھی ایک قول اسی معنی میں منقول ہے۔ مگر ایک دوسرا قول جو مؤخر الذکر دونوں اصحاب اور حضرت عائشہؓ سے پہنچا ہے‘ وہ یہ ہے کہ ختم مدت پر شوہر سے (قطعی طور پر) کہا جائے گا کہ اپنی بیوی سے رجوع کر و یا پھر اس کو طلاق دے دو۔ آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے پہلا قول ہی واضح اور صحیح معلوم ہوتا ہے۔ آیت قرآنی میں اللہ تعالیٰ نے مولی (ایلاء کرنے والا) کو بالفاظِ صریح صرف چار مہینے کی مہلت دی ہے اور اس کو رجوع کرنے کا حق اسی مدت کے اندر ہے۔ مدت کے ختم ہو جانے پر دوسری صورت صرف طلاق اور جدائی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے۔ اب اگر کوئی چار مہینے کے بعد شوہر کو رجوع کا حق دیتا ہے‘ تو وہ گویا اس مہلت میں اضافہ کرتا ہے‘ اور یہ اضافہ بظاہر کتاب اللہ کی مقرر کردہ حد سے زائد ہے۔[۱۵] (جاری ہے)

حواشی

(۱) صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب الصداق وجواز کونہ تعلیم القرآن۔

(۲) سنن الترمذی، ابواب النکاح، باب منہ۔

(۳) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب ما جاء ان الاعمال بالنیۃ۔ وصحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب فضل النفقۃ والصدقۃ علی الاقربین۔

(٤) صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب فضل النفقۃ علی العیال۔

(٥) رواہ البیہقی فی شعب الایمان

(٦) صحیح البخاری، کتاب النفقات، باب حبس نفقۃ الرجل قوت سنۃ علی اھلہ۔

(۷) صحیح البخاری، کتاب الاحکام، باب القضاء علی الغائب۔

(۸) معارف القرآن، از حضرت محمد شفیعؒ، جلد اول، ص ۵۷۳۔۵۷۴، طبع ۱۹۸۳ء ادارۃ المعارف، دارالعلوم، کراچی

(۹) تفسیر ابن کثیر، مترجم، جلد اول، ص ۳۲۵، ۳۲۷۔۳۲۸ طبع دوم، ۱۹۸۸ء، مکتبہ تعمیر انسانیت، لاہور

(۱۰) حقوق الزوجین از سید ابوالاعلیٰ مودودی، ص ۲۵۔ ۲۶، طبع ۱۹۴۳ء۔ شائع کردہ: دفتر ترجمان الاسلام، پٹھانکوٹ، پنجاب

(۱۱) معارف القرآن از حضرت مفتی محمد شفیعؒ، ج ۲، ص ۲۸۷ تا ۲۹۶، طبع جدید ۲۰۱۵ء، مکتبہ معارف القرآن، کراچی

(۱۲) حقوق الزوجین از سید ابوالاعلیٰ مودودی، ص ۲۶۔ ۲۷۔ بار دوم، طبع ۱۹۴۳ء۔ دفتر ترجمان القرآن، دارالاسلام پٹھان کوٹ۔

(۱۳) معارف القرآن از حضرت مفتی محمد شفیع، جلد اول، ص ۵۴۷، طبع فروری ۱۹۸۳ء، ادارۃ المعارف، دارالعلوم کراچی

(۱۴) قرآن مجید مع اردو ترجمہ از مولانا محمد جونا گڑھی، تفسیر از مولانا صلاح الدین یوسف، شاہ فہد قرآن کریم پرنٹنگ کمپلیکس، سعودی عرب

(۱۵) حقوق الزوجین از سید ابوالاعلیٰ مودودی، ص ۲۴۔ ۲۵، طبع دوم، دارالاسلام، پٹھانکوٹ، (انڈیا) مارچ ۱۹۴۳ء

❀❀❀

خلافت کی حقیقت، تاریخی پس منظر، عہد حاضر میں
اس کا ڈھانچہ اور اس کے قیام کے نبویؐ طریق پر مشتمل

خلافت کی حقیقت

اور عصرِ حاضر میں اس کا نظام

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

اشاعت خاص 200 روپے، اشاعت عام 120 روپے

''حُجۃ اللہ البالِغہ'' ایک عظیم کتاب

تحریر: ارسلان اللہ خان ☆

حضرت شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے سو سے زیادہ کتابیں تصنیف فرمائی ہیں۔ یوں تو ان کی ہر کتاب بیش قیمت ہے' البتہ ''حجۃ اللہ البالغہ'' ان میں سب سے منفرد' بے نظیر اور شہرۂ آفاق تصنیف ہے۔ بلاشبہ اس کتاب کو شاہ ولی اللہؒ کا "magnum opus" یعنی بہترین شاہکار کہا جاسکتا ہے۔ مولانا عبدالحق حقانیؒ نے حجۃ اللہ البالغہ کا جوار دو ترجمہ کیا ہے' اس کے عرضِ ناشر میں جناب اعجاز احمد صاحب لکھتے ہیں:

''شاہ صاحبؒ کی یہ تصنیف اسم بامسمّیٰ کتاب ہے' پھر اس کی عظمت کے کے لیے یہی کافی ہے کہ یہ کتاب مجدد الملّت حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی مایہ ناز تصنیف ہے۔ اس کے مطالعے کے بعد تفہیم و توضیحِ اصول کے لیے اگر کوئی اور کتاب نہ بھی پڑھی جاسکے تو یہی کتاب کفایت کرسکتی ہے۔''

جس طرح شاہ صاحبؒ نہایت جامع (comprehensive) اور ہمہ جہت (multi-dimensional) شخصیت کے حامل ہیں' اسی طرح آپ کی یہ تصنیف بھی ہمہ پہلو اور جامع ہے۔ کتاب کیا ہے' گویا علم و حکمت کا ایک بحرِ بے کراں ہے۔ وہ کون سا موضوع ہے جو اس کتاب میں شامل نہ ہو' قرآن و سُنّت' فقہ' علم و ادب' حکمت' فلسفہ و منطق' اصول و فروع' عبادات' تصوف' اخلاق' نفسیات' مابعد الطبیعیات' روحانیات' عمرانیات' احکامِ بیع و شراء' معیشت' معاملات اور آدابِ معاشرت' گویا ایک ہی تسبیح میں سارے موتی پرو لیے گئے ہیں۔ البتہ ڈاکٹر محمد مظہر بقاؒ نے اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے ''اصولِ فقہ اور شاہ ولی اللہؒ'' میں حجۃ اللہ البالغہ کے جملہ موضوعات کو ان تین عنوانات میں سمیٹ دیا ہے: ۱) فقہ ۲) حدیث ۳) حکمتِ دین۔

اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''علم الکلام اور کلام'' میں علامہ شبلی نعمانیؒ فرماتے ہیں:

''شاہ صاحبؒ نے علمِ کلام کے عنوان سے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی اور اس بنا پر اُن کو متکلمین کے زمرہ میں شمار کرنا بظاہر موزوں نہیں' لیکن ان کی کتاب حجۃ اللہ البالغہ جس میں انہوں نے شریعت کے حقائق اور اسرار بیان کیے ہیں' درحقیقت علمِ کلام کی روحِ رواں ہے۔

شاہ صاحبؒ نے علمِ کلام میں کیا اضافہ کیا؟ علمِ کلام درحقیقت اس کا نام ہے کہ مذہب اسلام کی نسبت یہ ثابت کیا جائے کہ وہ منزّل من اللہ ہے۔ مذہب دو چیزوں سے مرکب ہے: عقائد و احکام۔ شاہ صاحبؒ کے زمانہ تک جس قدر تصنیفات لکھی جاچکی تھیں صرف پہلے حصہ کے متعلق تھیں' دوسرے حصہ کو کسی

☆ لطیف آباد' حیدرآباد' سندھ' ای میل: khanarsalanullah@gmail.com

نے مَس نہیں کیا تھا۔ شاہ صاحبؒ پہلے شخص ہیں جس نے اس موضوع پر کتاب لکھی۔ خود دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ جس طرح آنحضرت ﷺ کو قرآن کا معجزہ عطا ہوا تھا جس کا جواب عرب وعجم سے نہ ہوسکا' اسی طرح آپ ﷺ کو جو شریعت عطا ہوئی تھی وہ بھی معجزہ تھی۔ کیونکہ ایسی شریعت کا وضع کرنا جو ہر طرح ہر لحاظ سے کامل ہو' طاقتِ انسانی سے باہر ہے' اس لیے جس طرح قرآن مجید کے معجزہ ہونے پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں' ضروری ہے کہ اس معجزہ کے متعلق بھی مستقل تصنیف لکھی جائے۔

پھر لکھتے ہیں کہ اہلِ بدعت نے اکثر اسلامی مسائل کے متعلق یہ اعتراض کیا ہے کہ وہ عقل کے خلاف ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ عذابِ قبر' حساب' پُل صراط' میزان کو عقل سے کیا تعلق ہے؟ رمضان کے اخیر دن کا روزہ واجب ہو اور شوال کی پہلی تاریخ کا حرام' اس کے کیا معنی؟ ترغیبات وترہیبات کے متعلق جو کچھ شریعت میں وارد ہے وہ ہنسنے کے قابل باتیں ہیں (معاذ اللہ)۔ غرض منکرین اس قسم کے بہت سے اعتراضات کرتے ہیں' ان کے جواب کے لیے ضروری ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ شریعت کی تمام باتیں عقل کے موافق ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے یہ دو غرضیں جو بیان کیں علمِ کلام کے اہم المقاصد ہیں اور اِس لحاظ سے ہم ان کی کتاب (حجۃ اللہ البالغہ) کو دراصل علمِ کلام کی کتاب قرار دیتے ہیں۔

شاہ صاحبؒ نے جن مہتم بالشان مسائل کلامیہ پر اپنی کتاب (حجۃ اللہ البالغہ) میں بحث کی ہے وہ حسبِ ذیل ہیں:

۱) انسان مُکلف کیوں پیدا کیا گیا ہے۔ یعنی اس کو اوامر ونواہی کی تکلیف کیوں دی گئی ہے۔
۲) خدا کی عادت یا فطرت میں تغیّر وتبدیلی نہیں ہوتی۔
۳) روح کی حقیقت۔
۴) جزا وسزا کی حقیقت۔
۵) واقعاتِ قیامت کی حقیقت۔
۶) عالمِ مثال۔
۷) نبوت کی حقیقت۔
۸) تمام مذاہب کی اصل ایک ہے۔
۹) اختلافِ شرائع کے اسباب۔
۱۰) ایک ایسے مذہب کی ضرورت جو تمام مذاہبِ قدیم کا ناسخ ہو۔''

(علم الکلام اور الکلام' از علامہ شبلی نعمانیؒ)

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اس کتاب کا نام قرآن کریم سے اخذ کیا ہے۔ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

﴿قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۚ فَلَوْ شَآءَ لَهَدٰىكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۴۹﴾﴾ (الانعام)

''آپ (ﷺ) فرما دیجیے پس اللہ ہی کی حجت پوری ہے' بے شک اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت فرما دیتا۔''

مولانا عبید اللہ سندھیؒ جو شاہ ولی اللہؒ کے کام پر سند (authority) کا درجہ رکھتے ہیں' انھوں نے حجۃ اللہ

البالغہ کی اردو شرح لکھی ہے۔ اس شرح میں دیے گئے مقدمہ کتاب میں شاہ صاحبؒ کا قول نقل کیا گیا ہے:

''قرآن مجید میں ہے کہ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ (پس اللہ ہی کی حجت پوری ہے)۔ چوں کہ اس آیت میں انسان کی ذمہ داری اور اس کے کرموں کے پھل اور خدا تعالیٰ کے بھیجے ہوئے قوانین کی حکمت کی طرف اِشارہ ہے اور یہ کتاب بھی اسی کا ایک شعبہ ہے اس لیے میں نے اس کتاب کا نام حجۃ اللہ البالغہ رکھا۔''

اسی شرح میں حجۃ اللہ البالغہ کا اجمالی تعارف بیان کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ یہ کتاب انسانوں کے شخصی اور اجتماعی مسائل، اخلاقیات، سماجیات اور اقتصادیات کی روشنی میں فلاحِ انسانیت کی عظیم دستاویز ہے۔

حجۃ اللہ البالغہ دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد کو سات حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور ہر حصہ میں ایک بحث شامل ہے۔ پھر ہر بحث کو کئی ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔ اس جلد میں وہ اصول بیان کیے گئے ہیں جن پر شریعتوں اور مذاہب کی مصلحتوں کا اِنحصار ہے۔

پہلی جلد کے ابواب مندرجہ ذیل ہیں:

۱) تکلیف اور جزا و سزا دینے کا بیان
۲) جزا و سزا کے بعد کی زندگی
۳) تدابیرِ نافعہ
۴) سعادت کا بیان
۵) نیکی و بدی کی حقیقت
۶) سیاستِ ملّیہ
۷) احادیثِ نبویہ ﷺ سے استنباط

جلد دوم: دوسرے حصہ میں حضرت شاہ ولی اللہؒ نے صحیح احادیث کی حکمت کی تشریح کی ہے۔ اس کے ابواب مندرجہ ذیل ہیں:

۱) ایمان و علم
۲) پاکیزگی
۳) نماز و زکوٰۃ
۴) روزہ
۵) حج
۶) احسان (تصوف)
۷) معاملات
۸) تدبیرِ منزل (خانہ داری)
۹) سیاستِ مدن (شہروں کا انتظام)
۱۰) آدابِ معیشت
۱۱) متفرقات

(اردو شرح حجۃ اللہ البالغہ، از مولانا عبید اللہ سندھیؒ)

شاہ صاحبؒ نے یہ کتاب ۱۷۳۵ء میں لکھی۔ اُس وقت ہندوستان پر محمد شاہ رنگیلا (دورِ اقتدار: ۱۷۱۹ء۔ ۱۷۴۸ء) کی حکومت تھی۔ انگریزوں کی مکاری اور مقامی لوگوں کی غداری عروج پر تھی۔ بادشاہ رنگیلا رنگ رلیوں میں مصروف تھا۔ ہر طرف طوائف الملوکی کا دور تھا۔ مرہٹے، سکھ اور جاٹ مسلمانوں کے لیے عذاب بن گئے تھے۔ نواب، راجے، مہاراجے ساز باز اور فتنہ پردازی میں مبتلا تھے۔ مسلمان معاشی، سماجی، مذہبی، معاشرتی اور اخلاقی غرض ہر اعتبار سے زوال اور پستی کا شکار تھے۔ بقول سید سلیمان ندویؒ:

''مغلیہ سلطنت کا آفتاب لبِ بام تھا' مسلمانوں میں رسوم اور بدعات کا زور تھا' جھوٹے فقراء اور مشائخ اپنے بزرگوں کی خانقاہوں میں مسندیں بچھائے بیٹھے تھے' مدرسوں کا گوشہ منطق اور حکمت کے ہنگاموں سے پرشور تھا۔'' (مقالاتِ سلیمانیہ)

ایسے پُرآشوب دور میں اُمت کی اصلاح کے لیے شاہ ولی اللہؒ نے قلمی جہاد کرتے ہوئے حجۃ اللہ البالغہ جیسی معرکۃ الآراء کتاب لکھی' جو رہتی دنیا تک کے مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

شاہ ولی اللہؒ وہ پہلے عالم ہیں جنہوں نے اَسرارِ شریعت کو موضوع بنایا۔ آپ کی تحریر کردہ اس لازوال کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری کبھی یوں محسوس کرتا ہے کہ عقل کے سارے مدارج طے کرنے والا ایک عبقری مفکّر کلام کر رہا ہے تو کبھی یوں لگتا ہے کہ ایک صوفی ملأ اعلیٰ سے الہام حاصل کر کے تصوف کے مسائل بیان کر رہا ہے۔

Marcia K Hermansen نے حجۃ اللہ البالغہ کا ترجمہ "The Conclusive Argument From God" کے نام سے کیا ہے۔ انہوں نے اس کتاب کے ابتدائیہ میں شاہ صاحبؒ کو برصغیر کا بہترین مفکّر قرار دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"The Conclusive Argument From God" is the master work of Shah Wali Ullah Of Delhi. He is considered to be the most important Muslim thinker of pre-modern South Asia.

سابق صدر شعبہ عربی جامع سندھ پروفیسر حسین جلبانی صاحب اپنی کتاب ''شاہ ولی اللہؒ کی تعلیم'' میں لکھتے ہیں:

''شاہ صاحبؒ جو کچھ پیش کرنا چاہتے تھے وہ حجۃ اللہ البالغہ کے مقدمے میں نہایت وضاحت سے بیان فرما چکے ہیں۔ شاہ صاحبؒ کہتے ہیں کہ ''شریعتِ مصطفوی ﷺ کے لیے وقت آچکا ہے کہ برہان اور دلیل کے لباس میں جلوہ گر ہو کر میدان میں آیا جائے۔ میرے نزدیک جملہ علومِ شریعت میں سب سے بہتر علم وہ ہے جس کا مقصد رموزِ دین کو وضاحۃً بیان کرنا ہے''۔ شاہ ولی اللہؒ اس کتاب میں ایک دانائے راز' ایک حکیم اور ایک عظیم فلسفی کے طور پر نظر آتے ہیں' جو ارسطو' کنفیوشس' تاؤ' ابنِ رُشد اور بوعلی سینا سے کہیں بڑھ کر ہے۔''

پروفیسر محمد سرور صاحب اپنی کتاب ''ارمغانِ شاہ ولی اللہؒ'' میں رقم طراز ہیں کہ:

''خود شاہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اپنے بارے میں لکھا ہے کہ ''میں خود اپنی ذات میں اکیلا ہوں۔ میں اپنی مٹی آپ ہی جمع کرتا ہوں۔ میں اپنے ہی بخت کا شاگرد ہوں''۔ یہاں شاہ صاحبؒ کی مجددانہ شان نظر آتی ہے۔''

حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ صاحبؒ نے جہاں بے شمار علوم وفنون پر قلم اُٹھایا ہے وہیں شاہ صاحبؒ ہی وہ پہلے فرد ہیں جنھوں نے عمرانیات (Sociology) کو باقاعدہ ایک مضمون کی حیثیت سے پیش کیا۔ کارل مارکس (۱۸۱۸ء۔۱۸۸۳ء) کو "Father of Socialism" کہا جاتا ہے جبکہ اس نے The Communist Manifesto اور Das Capital جیسی اعلیٰ پائے کی کتابیں ۱۸۴۸ء میں لکھیں۔ یعنی کارل مارکس سے ۱۱۳ سال قبل حضرت شاہ ولی اللہؒ نے Sociology کی بنیاد رکھ دی تھی۔ چنانچہ اگر تعصب کی عینک اُتار کر اور

Neutral Approach کے تحت تحقیق کی جائے تو بلاشبہ شاہ ولی اللہؒ ہی ''بابائے عمرانیات'' کہلانے کے حقدار ہیں۔

معروف اسلامی اسکالر ڈاکٹر اسرار احمدؒ اپنے ایک لیکچر میں حجۃ اللہ البالغہ کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ: ''اپنی مشہورِ زمانہ تصنیف حجۃ اللہ البالغہ کے ذریعے شاہ ولی اللہؒ نے حکمتِ دین کو باقاعدہ ایک علم کی حیثیت دے دی اور اسلام کے نظامِ عقائد' نظامِ عبادات اور نظامِ معاشرت و معاملات کو ایک مربوط اور منضبط نظامِ زندگی کی حیثیت سے پیش کیا' جس کی آنے والے دور میں شدید ترین ضرورت پیش آنے والی تھی۔''

ڈاکٹر اسرار احمد صاحبؒ مزید بیان کرتے ہیں کہ ہندوستان کے شہر حیدر آباد دکن سے ہجرت کر کے کراچی آ کر بسنے والے ڈاکٹر بشارت علی صاحب عمرانیات (Sociology) کے ماہر ہیں۔ انہوں نے عمرانیات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے اور وہ اس مضمون پر authority (سَنَد) سمجھے جاتے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ:

"Shah Wali Ullah is the greatest social thinker of the world."

گویا شاہ ولی اللہؒ دنیا بھر میں عمرانیات کے ماہر اعظم ہیں۔ (لیکچر ڈاکٹر اسرار احمدؒ)

حجۃ اللہ البالغہ ایک عظیم شخصیت کی عظیم کتاب ہے۔ افسوس کا مقام ہے کہ مغرب پرستی کی وجہ سے مسلمان اپنے علمی سرمائے سے یکسر غافل ہیں۔ بقول علامہ اقبال:

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے!

کاش کہ یہ کتاب ہر مسلمان کے گھر میں ہو اور ہم سب اس سے استفادہ کریں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس تحریر کو شرفِ قبول فرمائے۔ (آمین!) گر قبول افتد زہے عز و شرف!

❀❀❀

ایک مسلمان سے دین کے تین اہم تقاضے

مُطالباتِ دین

• عبادتِ رب • فریضہ شہادت علی الناس
• فریضہ اقامتِ دین

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

صفحات: 120 قیمت: 90 روپے

یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ
ایک علمی اور فقہی جائزہ (۲)

مقالہ نگار: پروفیسر حافظ احمد یارؒ

باب چہارم

وارثوں کے طبقات

فصل اوّل : فقہ حنفی کی رو سے

فقہ حنفی میں وارثوں کو دو طبقات میں تقسیم کیا جاتا ہے:

(۱) اصحاب الفروض: سب سے پہلے تو یہ دیکھا جائے گا کہ وارثوں میں سے ''اصحاب الفروض'' کون کون سے ہیں' چنانچہ اولاً ایسے لوگوں کا حصہ نکالا جائے گا۔

ذوی الفروض کُل بارہ ہیں[1]: (۱) باپ (۲) ماں (۳) خاوند (۴) بیوی (۵) بیٹی یا بیٹیاں (جبکہ میت کی صلبی اولادِ نرینہ موجود نہ ہو (۶'۷) حقیقی و علاّتی بہن یا بہنیں (جبکہ میت کی نہ اولاد موجود ہو نہ باپ) —— (۸'۹) اخیافی بھائی اور بہن (جبکہ میت کے نہ اولاد موجود ہو' نہ باپ اور نہ حقیقی بھائی بہن) (۱۰) پوتی (جبکہ میت کی اولاد میں صرف ایک لڑکی موجود ہو (۱۱) دادا (جبکہ میت کا باپ موجود نہ ہو) (۱۲) دادی یا نانی (جبکہ میت کا باپ یا ماں موجود نہ ہو)

نوٹ ۔ ۱: ان میں سے پہلے سات کا ذکر تو واضح طور پر قرآن مجید میں ہے' نمبر ۸ اور ۹ کے متعلق تمام امت کا اجماع ہے کہ سورۃ النساء کی آیت ۱۲ اخیافی بھائی بہن کی میراث کے متعلق ہے (اس کی تفصیل میں الجھنا ہمارے لیے خارج از بحث ہے)۔ نمبر ۱۰' ۱۱' ۱۲ کا ذکر قرآن حکیم میں نہیں ہے' بلکہ احادیث اور اجتہاد صحابہؓ سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تین قسم کے وارثوں کے اصحاب الفروض ہونے میں شیعہ سُنّی کا اختلاف ہے —— پوتی کے متعلق سند حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے مشہور فیصلہ سے لی جاتی ہے[2]۔ اسی طرح دادا دادی کے متعلق بھی مختلف ''آثار واردہ'' موجود ہیں' جن کی تفصیل ہمارے لیے غیر متعلق ہے۔

نوٹ ۔۲: خیال رہے کہ اصحاب الفروض کا مطلب یہ نہیں کہ ان تمام وارثوں کو ہر حال میں حصہ ملے گا۔ یہاں

فرض ضروری اور واجب کے معنوں میں نہیں بلکہ فریضہ یعنی مقرر کردہ حصہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ اور آیاتِ میراث میں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے[۳]۔ لہٰذا اصحاب الفروض سے مراد وہ لوگ ہیں جنہیں قرآن کے مقرر کردہ چھ قسم کے حصوں یعنی $\frac{1}{8}$، $\frac{1}{4}$، $\frac{1}{2}$، $\frac{1}{6}$، $\frac{1}{3}$ اور $\frac{2}{3}$ میں سے کوئی ایک حصہ حسبِ حالات دیا جاسکتا ہو۔ پس جب وارثوں میں اس قسم کا کوئی شخص یا اشخاص ہوں تو ان کے حصے سب سے پہلے ادا کیے جائیں گے۔[۴]

نوٹ۔۳: یہ بات قابلِ غور ہے کہ بیٹا کسی صورت میں بھی صاحب فرض نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اصحاب الفروض صرف وہ وارث ہیں جنہیں قبل از اسلام عرب جاہلیت میں وراثت سے کوئی حصہ نہیں دیا جاتا تھا اور قرآن اور شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کے حصے مقرر کردیے۔[۵]

(۲) عصبات: جب اصحاب الفروض میں سے کوئی نہ ہو یا ان کے حصے نکالنے کے بعد کچھ بچ رہے تو یہ ''بقایا جائیداد'' عصبات کو ملتی ہے۔

لفظ عصبہ دراصل جمع ہے عاصب کی اور پھر اس کی جمع عصبات بنائی جاتی ہے' اور اس لفظ (عصبہ) کا اطلاق مفرد' مثنی اور مذکر' مونث سب پر ہوتا ہے۔ لغت میں اس کے معنی وہ مرد ہے جو باپ کی طرف سے رشتہ دار ہو (قربة الرجل لابیه) یعنی بیٹا' بھائی' چچا یا ان کی اولاد نرینہ۔ عرب جاہلیت میں صرف یہی لوگ وراثت کے حق دار متصور ہوتے تھے۔ قرآن حکیم نے چونکہ ذوی الفروض کے حصص مقدم کردیے' اس لیے اب اصطلاح شرعی میں عصبہ اسے کہتے ہیں جو ذوی الفروض کے بعد وراثت کا حقدار ہو۔ اور اس میں بعض صورتوں میں (اور شیعہ کے نزدیک تمام صورتوں میں) برابر کے درجے کی عورتیں بھی شامل ہوتی ہیں۔

پھر عصبات کے مختلف درجات ہیں' اس ترتیب درجات کو ''جہاتِ عصوبت'' کہتے ہیں۔ یہ جہات مقرر کرنے کی بنیاد وہی آیاتِ میراث ہیں جن سے اسبابِ میراث کے باب میں بحث گزر چکی ہے[۶] اور یہ جہات حسبِ ذیل ہیں[۷]: (۱) البنوة یعنی اولاد یا اولاد کی اولاد (نیچے تک) ہونا۔ (۲) الابوة یعنی باپ یا باپ کا باپ (اور اسی طرح اوپر تک) ہونا (۳) الاخوة (باپ کی اولاد) یعنی بھائی یا بھائی کی اولاد (نیچے تک) ہونا (۴) العمومة (باپ کے باپ کی اولاد) یعنی چچا یا چچا کی اولاد (نیچے تک) ہونا (۵) ولاء۔ پہلے طبقہ کی موجودگی میں دوسرے کو اور دوسرے کی موجودگی میں تیسرے کو کچھ نہیں ملے گا[۸]۔ وعلیٰ ہذا آخر تک۔ اور ایک ہی طبقہ یعنی جہت میں زیادہ قریبی کی موجودگی میں نسبتاً دور والے رشتہ دار کو کچھ نہ ملے گا۔ یعنی قاعدہ اَلْاَقْرَبُ فَالْاَقْرَبُ ہر طبقہ کے افراد پر جاری ہوگا[۹]۔ اسی قاعدے کی بنا پر یتیم بھتیجا اپنے چچا کے مقابلے پر محجوب ہوجاتا ہے۔ کیونکہ اگرچہ دونوں عصبات کے طبقہ اوّل میں سے ہیں لیکن بیٹا اپنے باپ سے بلاواسطہ تعلق رکھتا ہے اور پوتا بالواسطہ۔ لہٰذا بیٹا اَقْرَب اور پوتا اَبْعَد ٹھہرا۔ اسی طرح بھائی کی موجودگی میں بھتیجا اور چچا کی موجودگی میں چچا زاد بھائی محجوب ہوجائے گا۔

ایک بات ظاہر ہے کہ اگر عصبات میں سے کوئی بھی موجود ہوگا تو جائیداد پوری کی پوری تقسیم ہو جائے گی اور کچھ باقی نہ بچے گا' لیکن اگر بالفرض ان تمام میں سے بھی کوئی نہ ہو تو تقسیم وراثت کے لیے علی الترتیب مزید نیچے بھی طبقات مقرر کیے گئے ہیں اور گو یہ ہمارے موضوع سے خارج ہیں' کیونکہ پوتا اور پوتی عصبات کی قسم اول میں سے ہیں' تاہم ازدیادِ معلومات کے لیے تمام مراتبِ استحقاقِ وراثت کو حاشیہ میں درج کیا جاتا ہے۔[10]

فصل دوم: فقہ جعفری کی رو سے

فقہ جعفری میں نسبی وارثوں کے تین طبقات ہیں اور ہر طبقہ میں دو ذیلی طائفے ہیں۔ پہلا طبقہ دوسرے طبقہ کو اور دوسرا تیسرے طبقہ کو محجوب کر دیتا ہے۔ لیکن ہر طبقہ کے دونوں ذیلی طائفے بیک وقت وراثت پاتے ہیں[11] اس طرح کہ ہر ذیلی طائفہ میں قریب کا رشتہ دار بعید کو محجوب کر دیتا ہے[12] گویا حجاب بالشخص میں بیان کردہ قاعدہ ''ادلاء''[13] کی رعایت ایک حد تک ورثاء کی طبقہ بندی میں کر لی گئی ہے اور دوسرا قاعدہ ''**الاقرب فالا قرب**'' ہر طبقہ کے دونوں طائفوں پر الگ الگ جاری ہوتا ہے۔

یہ تقسیم طبقات اس طرح پر ہے[14] (ہر ایک طبقہ کے ساتھ اس کے دونوں ذیلی طائفے درج ہیں)۔ پہلا طبقہ (ا) والدین (ب) اولاد اور اولاد کی اولاد نیچے تک۔

دوسرا طبقہ (ا) دادا دادی اور نانا نانی اوپر تک (ب) بھائی بہن اور ان کی اولاد نیچے تک۔

تیسرا طبقہ (ا) متوفّٰی' اس کے والدین یا والدین کے والدین کے چچا یا پھوپھی اور ان کی اولاد در اولاد۔ (ب) متوفّٰی' اس کے والدین یا والدین کے والدین کے ماموں یا خالہ اور ان کی اولاد در اولاد۔

زوج اور زوجہ وراثت سے کبھی محروم نہیں رہ سکتے' وہ ہر طبقہ کے ساتھ اپنا مقررہ حصہ پائیں گے اور ان کا حصہ نکالنے کے بعد متروکہ دیگر ورثہ میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ البتہ چونکہ شیعہ جواز متعہ کے بھی قائل ہیں' پس جب مرد اور عورت میں متعہ ہوا ہو تو ایک دوسرے کا وارث نہیں ہو سکتا' اِلا اینکہ بوقت متعہ اس مضمون کی کوئی شرط کر لی گئی ہو[15]۔

اب دیکھئے اس تقسیم کی رو سے پوتا پوتی طبقہ اول کے طائفہ دوم میں سے ہیں۔ پس اگر تو اس طائفے میں پوتے پوتیاں یا نواسے نواسیاں ہی ہوں گے (یعنی ایک ہی درجے کے) تو اپنے اپنے باپ یا ماں کے قائم مقام ہو کر اس طرح وراثت پائیں گے' جس طرح ماقبل قسط اول میں حاشیہ میں تشریح کی جا چکی ہے[16] لیکن اگر ان کے ساتھ اسی طائفے کا کوئی ''اوپر کے درجے'' کا وارث موجود ہوا تو محجوب ہو جائیں گے' حتیٰ کہ شیعہ تقسیم وراثت کی رو سے پھوپھی بھی اپنے یتیم بھتیجے یا بھتیجوں کو محجوب کر دیتی ہے[17] کیونکہ قاعدہ **الاقرب فالا قرب** اہل السنّت کے ہاں تو صرف عصبات مذکر میں چلتا ہے' لیکن امامیہ کے ہاں بغیر امتیازِ تذکیر و تانیث صرف بلحاظِ رشتہ یہ قاعدہ جاری ہوتا ہے۔[18]

اگر ان تینوں طبقوں میں سے کوئی بھی وارث موجود نہ ہو تو اہل السنّت کی طرح شیعہ میں بھی تقسیم وراثت کے لیے علی الترتیب مزید نیچے کے طبقات مقرر ہیں۔ فقہ جعفری کی رو سے تمام مراتب استحقاق وراثت اخیر تک

یوں ہیں: (۱) طبقہ اولیٰ (۲) طبقہ ثانیہ (۳) طبقہ ثالثہ (۴) معتق (آزاد کرنے والا) (۵) ضامن جریرہ (عہدی وارث) (۶) امام علیہ السلام[۱۹] —— ان میں سے ہر پہلی قسم اپنے سے دوسری قسم کو محجوب کر دیتی ہے' البتہ زوجین ہر حال میں حصہ پائیں گے۔[۲۰]

فصل سوم: شیعہ سُنّی فقہ کی رو سے پوتے کے متعلق احکام کی عملی وضاحت

مسئلہ زیر بحث کی اصل حقیقت ذہن نشین کرنے اور فقہ حنفی و فقہ جعفری کے قوانینِ وراثت کو سمجھانے کے لیے گزشتہ دو فصلوں میں جو تفصیل بیان ہوئی ہے اب اس کی عملی توضیح کے لیے چند مثالیں دی جاتی ہیں۔ ان تمام مثالوں میں پوتے پوتی وغیرہ (اولاد در اولاد) کو شامل رکھا گیا ہے۔

مثال ۱:

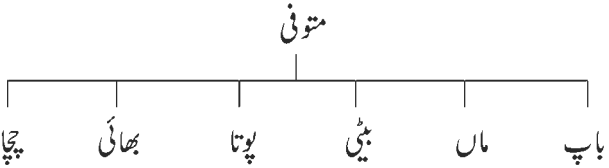

حنفی فقہ فرائض کے لحاظ سے: باپ' ماں اور بیٹی ذوی الفروض سے ہیں' اس لیے پہلے ان کا حصہ $\frac{1}{6} + \frac{1}{6} + \frac{1}{2} = \frac{5}{6}$ نکالا جائے گا۔ باقی وارثوں میں سے پوتا جہت اول کے عصبات میں سے ہے اور بھائی اور چچا تیسرے اور چوتھے درجے کے۔ پس پوتا ان کو محجوب کر کے بقایا ۱/۶ کا مالک ہوگا۔

شیعہ فقہ فرائض کے لحاظ سے: باپ' ماں' بیٹی اور پوتا طبقہ اولیٰ کے وارث ہیں' اس لیے یہ بھائی اور چچا کو محجوب کر دیں گے' کیونکہ وہ طبقہ دوم وسوم میں سے ہیں۔ پھر طبقہ اول کے چار وارثوں میں سے ماں باپ پہلے طائفہ کے ہیں اس لیے پہلے انہیں ان کا حصہ یعنی $\frac{1}{6} + \frac{1}{6} = \frac{1}{3}$ دیا جائے گا۔ اب بیٹی اور پوتا ہر دو طبقہ اول کے طائفہ دوم میں سے ہیں' لیکن بیٹی پوتے کی نسبت قریب تر ہونے کے باعث پوتے کو محجوب کر کے بقایا $\frac{2}{3}$ حصہ کی مالک ہوگی۔

نوٹ: اسی صورتِ مسئلہ میں اگر بیٹی کے بجائے بیٹا ہو تو بالاتفاق بقایا $\frac{2}{3}$ وہی لے گا اور پوتا محجوب ہوگا۔

مثال ۲:

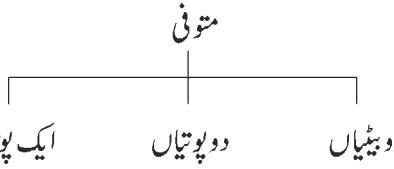

اہل السنّت کے نزدیک: دونوں بیٹیاں بحیثیت ذوی الفروض $\frac{2}{3}$ لیں گی اور چونکہ پوتا اور پوتیاں ایک ہی درجے اور طبقے کے عصبات ہیں اس لیے بقایا $\frac{1}{3}$ ان میں لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ تقسیم ہوگا (چاہے ان

کے باپ مختلف بھی ہوں) دونوں پوتیاں $\frac{1}{3}$ کا $\frac{1}{2}$ = $\frac{1}{6}$ اور اتنا ہی پوتا لے گا۔

اہل تشیع کے نزدیک: تمام ورثا طبقہ اوّل ہی کے ہیں ـــــ لیکن بیٹیاں قریب تر ہونے کے باعث تمام جائیداد کی مالک ہوں گی اور پوتا اور پوتیاں محجوب ہو جائیں گے۔

مثال ۳:

فقہ حنفی کی رو سے: دادا بطور ذی الفرض $\frac{1}{6}$ لے گا۔ باقی جائیداد بیٹے اور بیٹی میں ۲:۱ کی نسبت سے تقسیم ہوگی اور پوتا محجوب ہوگا۔

فقہ جعفری کی رو سے: دادا طبقہ دوم کا وارث ہے' لہٰذا محجوب ہو جائے گا۔ طبقہ اول کے وارثوں میں سے بیٹا بیٹی ایک ہی درجے کے ہیں' لہٰذا تمام جائیداد ان میں ۲:۱ کی نسبت سے تقسیم ہوگی اور پوتا محجوب ہو جائے گا۔

مثال ۴:

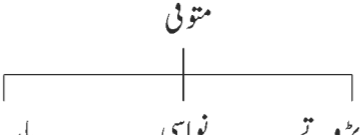

حنفی فقہ کی بنا پر: باپ بطور ذی الفرض $\frac{1}{6}$ حصہ لے گا۔ نواسی ذوی الارحام میں سے ہے' لہٰذا اسے کچھ نہ ملے گا اور بقایا $\frac{5}{6}$ دونوں پڑوتوں میں (بحصہ برابر) تقسیم ہوگا' یعنی ہر ایک کو جائیداد کا $\frac{5}{12}$ حصہ ملے گا۔

شیعہ فقہ کی بنا پر: تمام وارث طبقہ اول کے ہی ہیں۔ باپ پہلے طائفے کا ہے پس اسے تو مقررہ حصہ $\frac{1}{6}$ ملے گا۔ دونوں پڑوتے اور نواسی طبقہ اول کے طائفہ دوم سے ہیں اور ان میں سے نواسی قریب تر ہے' لہٰذا پڑوتے محجوب اور بقایا $\frac{5}{6}$ حصہ کی مالک صرف نواسی ہوگی۔

مثال ۵:

(دوسری بیٹی سے جو مر چکی ہے)

فقہ حنفی کی رو سے: دادی' بیوی اور بیٹی ذوی الفروض ہیں پہلے ان کو حصہ دیا جائے گا جو بالترتیب $\frac{1}{6} + \frac{1}{8} + \frac{1}{2} = \frac{19}{24}$ ہوگا۔ نواسہ ذوی الارحام میں سے ہے' لہٰذا محروم ہوگا اور بقایا $\frac{5}{24}$ حصہ پوتے کو ملے گا' کیونکہ وہ قسم

اول کے عصبات میں سے ہے اور بھائی اس کی وجہ سے محجوب ہو جائے گا۔

شیعہ قانون وراثت کی رو سے: دادی اور بھائی طبقہ ثانیہ میں سے ہیں' لہٰذا وہ محجوب ہو جائیں گے۔ بیوی کو اس کا مقررہ حصہ $\frac{1}{8}$ مل جائے گا۔ باقی تمام وارث طبقہ اول کے ایک ہی طائفے سے ہیں' لیکن بیٹی قریب تر ہونے کے باعث نواسے اور پوتے کو محجوب کر کے بقایا $\frac{7}{8}$ حصہ جائیداد کی مالک ہوگی۔

☆ ان چند مثالوں سے دو باتیں بالکل واضح ہیں:

(۱) پوتا ہر حال میں جائیداد سے محروم نہیں ہوتا۔ وہ ''محجوب الارث'' ہے ''ممنوع الارث'' نہیں۔ یعنی اسلام میں محض یتیم ہونا کوئی ایسا دیوانی جرم نہیں کہ اس کی سزا میں جائیداد سے محروم کر دیا جاتا ہو[۲۱]۔ بلکہ پوتا بھی بعض خاص حالات میں محجوب ہوتا ہے' جس طرح بھائی' بہن' چچا' دادا' بھتیجا وغیرہ دوسرے وارث بعض خاص حالات میں محجوب ہو جاتے ہیں۔

(۲) اس تمام تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے (اور ویسے بھی یہ بات بالکل بدیہی سی ہے) کہ ہر وارث کی حیثیت بدلتی رہتی ہے اور اسی لحاظ سے اس کے حصہ میں بھی کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ چنانچہ فقہاء نے (اللہ تعالیٰ ان کی غلطیوں سے درگزر فرمائے اور ان کی مساعی کی جزائے خیر دے) تتبع و استقراء سے ہر قسم کے وارثوں کے تمام ممکن پیش آمدہ حالات کو الگ الگ عنوانات قائم کر کے بھی بیان کیا ہے' اس طرح سے وارثوں کی کل ۱۳۰ اقسام بنتی ہیں۔[۲۲]

اس سلسلہ میں ہمارے موضوع بحث یعنی پوتے اور پوتی کے احکام کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:[۲۳]

پوتا

(۱) جب میت کا کوئی بیٹا نہ ہو تو اسے بیٹا ہی سمجھا جائے گا۔

(۲) بیٹے کی موجودگی میں محجوب ہو جاتا ہے' چاہے وہ اس کا باپ نہ ہو۔

(۳) اسی طرح نچلے درجے کا پوتا (مثلاً پڑوتا) اپنے سے اوپر کے درجے کے پوتے سے محجوب ہو جاتا ہے۔

(۴) کبھی ترکہ ذوی الفروض میں پوری طرح تقسیم ہو جانے کے باعث محروم ہو سکتا ہے۔ (مثلاً جب کسی آدمی کی دو بیٹیاں' والدین اور ایک پوتا رہ جائے تو $\frac{1}{3}$ والدین اور $\frac{2}{3}$ بیٹیوں کو ملے گا اور پوتا محروم رہے گا)۔

پوتی

(۱) میت کا بیٹا ہو نہ بیٹی تو مثل بیٹی کے سمجھی جائے گی۔

(۲) بیٹے کی موجودگی میں یا اپنے سے اوپر کے درجے کے پوتے سے بھی محجوب ہو جائے گی۔

(۳) صرف ایک صلبی بیٹی ہو یا اپنے سے اوپر کے درجے کی صرف ایک پوتی موجود ہو تو اس کے ساتھ بطور ذی فرض کے $\frac{1}{6}$ حصہ پائے گی۔

(۴) اپنے بھائی یا چچا کے بیٹے کے ساتھ عصبہ ہو جائے گی۔

(۵) اگر $\frac{2}{3}$ میں سے اسے کچھ نہ مل رہا ہو (یعنی جب اوپر کے درجے کی ایک سے زیادہ بیٹیاں یا پوتیاں موجود ہوں) تو اپنے سے نیچے کے درجے کے پوتے کے ساتھ عصبہ ہو کر حصہ پائے گی۔

(۶) اور اگر $\frac{2}{3}$ میں سے بھی اسے کچھ نہ مل سکتا ہو اور ساتھ عصبہ بنانے والا بھی کوئی نہ ہو تو اس صورت میں محجوب ہو جائے گی۔

یہ احکام اہل السنّت والجماعت کے مذہب کے مطابق ہیں۔[۲۴] شیعہ قانون وراثت میں پوتے پوتی اور نواسے نواسی کے احکام یکساں ہیں[۲۵] یعنی (۱) اولاد نہ ہونے کی صورت میں ہر بیٹی یا بیٹے کی اولاد اپنے باپ یا ماں کا حصہ علی النسب پائے گی اور (۲) قریب تر بعید کو محجوب کر دیتا ہے۔

اس وقت تک جو کچھ خامہ فرسائی کی گئی ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ چچا کی موجودگی میں (اور شیعہ کے نزدیک پھوپھی کی موجودگی میں بھی) بھتیجا (یتیم پوتا) اپنے دادا یا دادی کی جائیداد سے **بطور وراثت** کچھ نہیں پا سکتا۔ اور یہ نتیجہ ہے قرآن کے لفظ ''الاقربون'' اور ''اولیٰ'' کی قانونی اور فقہی تعبیر کا۔[۲۶]

لطف کی بات تو یہ ہے کہ اگرچہ طریق تعبیر اور اندازِ فکر جدا جدا ہے لیکن نتیجہ بہر حال ایک ہی نکلتا ہے اور سچ پوچھئے تو مسئلہ کے باقی پہلو (مثلاً یہ کہ جب صرف پوتے پوتیاں وارث ہوں تو جائیداد کس طرح تقسیم ہوگی؟ **علی الرؤوس یا علی النسب؟**) ایک ثانوی حیثیت رکھتے ہیں —— اصلی معرضِ بحث اور نفس مدعا ''یتیم پوتے کی وراثت کے مسئلہ'' میں یہی صورت ہے کہ وہ اپنے چچا کی موجودگی میں کیوں کر محجوب ہو سکتا ہے؟ —— سو اس کے متعلق ہر مکتب خیال کے فقہاء کا طریق استدلال اور اس کا نتیجہ گزشتہ اوراق میں پیش کیا جا چکا ہے۔ لیکن ابھی یہ فسانہ اپنے نقطۂ کمال (Climax) تک نہیں پہنچا۔ اس کا ایک اور پہلو بھی آپ کے سامنے لانا ہے۔

حواشی اور حوالہ جات

(۱) فتاویٰ عالمگیری ۴۲۱/۱۰، نیز تمام کتب فقہ فرائض۔

(۲) مصادر الاحکام الشرعیہ ۱۲۴/۳، نیز مقالہ ہٰذا کا اگلا باب (پنجم) ملاحظہ کیجیے۔

(۳) المواریث الاسلامیہ، ص ۹۔

(۴) کُتبِ فرائض میں عموماً ان تمام حصوں پر فرداً فرداً بحث کی جاتی ہے جس سے پتہ چل جاتا ہے کہ کس کس صورت میں کس کس وارث کو کون سا حصہ ملے گا، مثال کے طور پر دیکھئے: المواریث الاسلامیہ، ص ۳۱ تا ۳۴۔

(5) Mohammaden Law F.B.Tyab ji p.826

(۶) نیز دیکھئے مقالہ ہٰذا، پہلا حصہ، باب دوم، عنوان: اسباب میراث۔

(۷) المواریث الاسلامیہ، ص ۳۴۔ سراجی، ص ۱۳۔

(۸) یہ احناف کا مسلک ہے، شوافع اور موالک کے نزدیک نمبر ۲ اور نمبر ۳ بیک وقت بھی وارث ہوتے ہیں۔ نیز مقابلہ کے لیے دیکھئے شیعوں کی تقسیم طبقات ورثاء (مقالہ ہٰذا) میں طبقہ ثانیہ۔

(۹) المقارنات التشریعیہ ۴۷/۴ و شریفیہ، ص ۴۳۔۴۴۔

(۱۰) یہ ترتیب اس طرح پر ہے: (۱) **اصحاب الفروض** (۲) **عصبات** (۳) **معتق** (آزاد کرنے والا) اور معتق کے

عصبات (۴) الرد علی ذوی الفروض غیر الزوجین (یعنی خاوند یا بیوی کے علاوہ دوسرے اصحاب الفروض کو بذریعہ رد بقایا بھی تقسیم کر دینا) (۵) ذوی الارحام (وہ وارث جن کا تعلق میت کے ساتھ بذریعہ اس کی بیٹی یا بہن یا ماں یا پھوپھی کے ہو) (۶) مولی الموالات (عہدی وارث) (۷) المقرله بالنسب علی الغیر یعنی وہ مجہول النسب آدمی جس کے حق میں متوفی نے کسی ایسی قرابت کا اقرار کیا ہو جو خود اس متوفی کے ذریعے نہیں بلکہ کسی اور واسطے سے قائم ہو سکتی ہو (۸) الموصی لهٗ بما زاد علی الثلث یعنی ایسا شخص جس کے متعلق متوفی نے اپنی تہائی سے زیادہ جائیداد کی وصیت کی ہو (۹) بیت المال۔

نوٹ: پہلی پانچ اقسام اہل السنّت کے نزدیک متفق علیہ ہیں' آخری چار مراتب میں احناف' شوافع اور حنابلہ کا باہمی جزوی اختلاف ہے۔ تفصیل کے لیے دیکھئے: المواریث الاسلامیہ علی المذاهب الاربعه' ص ۱۵'۱۷۔

(۱۱) کتاب الفرائض من شرائع الاسلام' ص ۲' وفتاویٰ المیراث' ص ۲۳۔۲۴ اور امیر علی محمڈن لاء (انگریزی)' ص ۹۔

(۱۲) البتہ طبقہ ثالثہ میں محض قریبی کو وراثت ملتی ہے' چاہے وہ کسی طائفے سے ہو' دیکھئے' مختار المسائل' ص ۱۶۶۔

(۱۳) مقالہ ہذا' پہلا حصہ' باب سوم' عنوان: حجاب۔

(۱۴) کتاب الفرائض من شرائع الاسلام' ص ۲' نیز مختار المسائل' ص ۱۵۴۔

(۱۵) جامع الاحکام' ۷۱/۱۔

(۱۶) نیز دیکھئے مختار المسائل' ص ۱۵۶۔ یہ کتاب ایران کے تین مشہور مذہبی رہنماؤں یعنی آیت اللہ کاشانی' نجم الملہ اور ناصر الملہ کے فتاویٰ اور تحریروں کا مرتب اردو ترجمہ ہے۔ لہٰذا شیعہ فقہ کی مستند کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔

(۱۷) کتاب الفرائض من شرائع الاسلام' ص ۱۰۔

(۱۸) امیر علی کا محمڈن لاء (انگریزی)' ص ۹۔

(۱۹) یہاں یہ بیان کر دینا دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا کہ ہر قسم کے وارثوں کی عدم موجودگی میں اہل السنّت کے نزدیک سب سے آخر پر سرکاری خزانہ (بیت المال) وارث قرار پاتا ہے۔ (دیکھئے اہل السنّت کے مراتب استحقاقِ وراثت) لیکن شیعہ وراثت میں بیت المال کے نام سے ہی بیزار ہیں۔ ان کے نزدیک بالکل ہی لاوارث آدمی کا مال امام غائب علیہ السلام کا مال ہے اور غیبت امام میں وہ مال نائب امام یعنی مجتہد کو ملے گا' جو اس مال کو اس شہر کے غرباء میں تقسیم کرے گا جس کا متوفی باشندہ تھا۔ (لاوارث مال کے متعلق خوارج کا نظریہ بھی اس سے ملتا جلتا ہے' دیکھئے مقالہ ہذا' پہلا حصہ' باب دوم کا حاشیہ (۵)۔ اس مسئلہ پر دلچسپ اور قابلِ مطالعہ بحث کے لیے دیکھئے امیر علی کی جامع الاحکام ۱۷/۱' ص ۵۴ نیز ۷۵ ببعد۔

(۲۰) دیکھئے مختار المسائل' ص ۱۶۵'۱۶۶۔

(۲۱) افسوس ہے کہ بعض حضرات کی طرف سے عمداً یا عدم واقفیت کی بنا پر یہ مسئلہ کچھ اسی انداز میں پیش کیا جاتا ہے جو اسلام بیزاری کے سٹنٹ سے کم نہیں ہے۔ ادارہ طلوعِ اسلام کراچی کے رسالہ ''یتیم پوتے کی وراثت'' کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں ـــــ ''ملا کا مذہب ہے کہ زید (متوفی دادا) کی ساری جائیداد عمرو (بیٹے) کو مل جائے گی۔ حامد (یتیم پوتا) کو کچھ نہیں ملے گا (یہ پوری مثال مقالہ ہذا کے دوسرے حصہ میں باب دوم فصل اول میں دی ہوئی ہے) اس کا قصور؟ یہی کہ وہ یتیم ہے' باپ کا سایہ نہیں' اسے وراثت سے کیوں نہ محروم کیا جائے؟'' ـــــ (دیکھئے تین اہم مسائل صفحہ ۱۴۴) ـــــ اس قسم کی تحریروں کا مسئلہ سے ناآشنا لوگوں پر (جن میں

عوام ہی نہیں خواص بھی شامل ہیں) جو اثر پڑا ہے اس کا اندازہ اس لطیفہ سے لگا لیجیے: ایک معمر اور اعلیٰ تعلیم یافتہ بزرگ سے دوران گفتگو مقالہ ہذا کا ذکر آ گیا۔ فرمانے لگے ''بھئی میں تو اسی لیے اپنی زندگی میں اپنے بیٹوں کے نام مکان منتقل کر رہا ہوں، کہیں میرے بعد ان کے چچا ان سے جھگڑا نہ کریں''۔ میں نے تعجب سے پوچھا کہ جب آپ کے والد بزرگوار بھی زندہ نہیں اور مکان بھی آپ کے نام ہے تو پھر آپ کو کیا فکر لاحق ہے؟ فرمانے لگے ''ارے میاں! یہ جو سنا ہے کہ جو یتیم ہو جائے اسے وراثت سے کچھ نہیں ملتا''۔ گویا ان کے خیال میں باپ کے مرنے پر چونکہ اس کی اولاد یتیم ہو جاتی ہے اس لیے وراثت سے محروم ہو گی۔ اِنا للہ وانا الیہ راجعون!

(۲۲) دیکھئے المواریث الاسلامیہ، ص ۳۵ تا ۳۸، نیز جدول مؤلفہ علامہ ابن الہائم در کتاب مذکور۔

(۲۳) سراجی، ص ۷ تا ۹ و المواریث الاسلامیہ، ص ۳۷۔۳۸۔

(۲۴) سراجی، ص ۷ تا ۹ والمواریث الاسلامیہ، ص ۳۷۔۳۸ وبدایۃ المجتہد، ج ۲، ص ۳۳۴۔

(۲۵) فتاوی المیراث، ص ۱۴، وجامع الاحکام، ج ۱، ص ۳۹ نیز بدایۃ المجتہد، ج ۲، ص ۳۳۶۔

(۲۶) اور جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہو گا ''اقربیت'' کی اس قدر تنقیح کی ضرورت اس لیے درپیش آئی کہ اسلامی قانونِ وراثت میں اصول قائم مقامی بطورِ قاعدہ کلیہ کے عملاً ہرگز جاری نہیں ہو سکتا۔ یہاں شروع ہی سے وراثت متعدد سمتوں میں روانہ ہوتی ہے۔ اگر اسے صرف ایک سمت (جہت) مثلاً فرع (اولاد) میں چلنا ہوتا تو سرے سے ''اقربیت'' کے قاعدے کی ضرورت ہی درپیش نہ آتی۔ اس پر بالتفصیل بحث کے لیے دیکھئے مقالہ ہذا کا دوسرا حصہ، باب دوم، فصل اول و دوم۔

باب پنجم

مقامِ حیرت؟

اب تک جو کچھ بیان ہو چکا ہے اس سے ظاہر ہے کہ یتیم پوتا ''اقربیت'' ہی کی تشریح کا ''شکار'' ہو رہا ہے۔ اس پر یہ خیال آ سکتا تھا کہ شاید ''اَقْرَب'' کی یہ تشریح (جس میں بظاہر اس لفظ کے عرفی و نفسیاتی پہلو کو نظر انداز کر کے محض صرفی و نحوی پہلو کو سامنے رکھا گیا ہے) شاید کسی ایک یا چند منطقی دماغوں کی کاوش اور محض تعبیرِ الفاظ کی شعبدہ گری اور قانونی جمناسٹک ہو۔ لیکن تعجب پر تعجب ہے کہ اقرب کی یہ تعبیر ایسی متفق و مجمع علیہ ہے کہ گزشتہ ساڑھے تیرہ صدیوں میں آج تک کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا ہے۔ آپ وراثت کی کوئی کتاب اٹھا لیں۔ چاہے وہ کسی مذہب فکر کی نمائندہ ہو، ہر جگہ ''الاقرب فالا قرب'' کا قاعدہ اور اس کی توضیح میں سب سے پہلی مثال ہی یہی دی ہوئی ملے گی ''جس طرح بھتیجا اپنے چچا سے محجوب ہو جاتا ہے''۔ زہے قسمت!

پھر یہ بات صرف فقہاء تک نہیں رہ جاتی، بلکہ اس کا سلسلہ آگے چلتا ہے اور دورِ صحابہؓ تک یتیم پوتے کے محجوب ہونے کے بالکل واضح ثبوت ملتے ہیں، جن کا ذکر ابھی اسی باب میں ہو گا۔

سب سے زیادہ استدلال حدیث: ((اَلْحِقُوا الْفَرَائِضَ بِاَهْلِهَا، فَمَا بَقِيَ فَهُوَ لِاَوْلٰى رَجُلٍ ذَكَرٍ))

(متفق علیہ) سے کیا جاتا ہے۔ (۱) یعنی اصحاب الفروض کو دینے کے بعد جو کچھ بچے وہ قریب ترین مرد کو دے دو ——لیکن اگر یہ بھی فرض کر لیا جائے کہ ''اقرب'' کی طرح یہاں بھی ''اولیٰ'' کا مفہوم سمجھنے میں غلطی لگی ہوگی (۲) اور اس احتمال کو بھی مان لیں کہ یہ حدیث کسی خاص واقعہ سے متعلق ہو جس کی جزئیات کا ہمیں علم نہ ہو سکا ہو اور خاص اسی واقعہ یا اس جیسے واقعہ میں ''اولیٰ'' اپنے ان معنوں میں لیا جاسکتا ہو——تو بھی مندرجہ ذیل تصریحات کا کیا کیا جائے؟

(۱) صحیح بخاری میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا فتویٰ موجود ہے کہ:

ولد الابناء بمنزلة الولد، اذا لم یکن دونهم ولد ذکر ذکرهم کذکرهم وانثاهم کانثاهم، یرثون کما یرثون و یحجبون کما یحجبون، ولا یرث ولد الابن مع الابن (۳)

''بیٹوں کی اولاد بیٹوں ہی کے حکم میں ہے جبکہ ان کے علاوہ (میت کا) اور کوئی بیٹا موجود نہ ہو۔ ان میں لڑکے لڑکوں کی طرح اور لڑکیاں لڑکیوں کی طرح میراث پائیں گے۔ اور ان میں اولاد ہی کی طرح احکامِ میراث و حجاب جاری ہوں گے اور بیٹے کی اولاد (پوتا یا پوتی) بیٹے کی موجودگی میں وراثت نہیں پائے گی۔''

انہی زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: ((وَاَفْرَضُهُمْ زَيْدُ بْنُ ثَابِتٍ)) یعنی زیدؓ تمام صحابہ سے بڑھ کر علم الفرائض کے ماہر ہیں۔ پھر ان کے اس فتویٰ پر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اجماع کر لیا تھا (۴) اور اُمت کے کسی فرد نے گزشتہ چودہ صدیوں میں اس پر اعتراض نہیں کیا۔

خیال رہے کہ اس جگہ ''ولد الابن'' سے بوجہ لام معرفہ اور تکرار معرفہ کے صرف زندہ بیٹے کا بیٹا (یعنی وہ پوتا جس کا باپ زندہ ہے) مراد نہیں لیا جاسکتا اور نہ آج تک کسی نے یہ مطلب لیا ہے' کیونکہ اولاً تو باپ کے ہوتے اس کی اولاد کو کچھ نہ ملنا خود قرآن سے بدیہی وصریح طور پر ثابت ہے (۵) ثانیاً تکرارِ معرفہ میں ثانی سے اول ہی مراد لینا' اصولِ فقہ کا قاعدہ کلیہ نہیں ہے جس کی بنا پر یہاں لازماً یہی معنی لیے جائیں۔ ثالثاً حدیث میں لفظ ''ولد'' بصورت نکرہ موجود ہے۔ یعنی پوتے صرف اس صورت میں وارث ہو سکتے ہیں جب ''کوئی بھی بیٹا'' موجود نہ ہوگا۔ رابعاً اگر زندہ بیٹے کا بیٹا ہی مراد ہوتا تو اس کے لیے سیدھی عبارت یوں ہوتی: **ولا یرث ولد الابن مع ابیه۔**

(۲) اسی صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا واقعہ درج ہے (۶) کسی شخص نے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے —— جب وہ عہدِ عثمانی میں کوفہ کے حاکم تھے (۷) —— پوچھا کہ ایک میت کے وارث اس کی بیٹی' پوتی اور بہن ہیں۔ ترکہ کیوں کر تقسیم ہو؟ انہوں نے نصف جائیداد بیٹی کو اور باقی نصف بہن کو دینے کا فتویٰ دیا اور پوتی کو محروم رکھا۔ لیکن ساتھ ہی سائل کو ابن مسعودؓ کی خدمت میں بھیج دیا۔ انہوں نے بیٹی کو $\frac{1}{2}$' پوتی کو $\frac{1}{6}$ (جو مل کر $\frac{2}{3}$ یعنی دو بیٹیوں کا حصہ بنتا ہے) اور بہن کو بقایا $\frac{1}{3}$ دلایا اور کہا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی قسم کے مسئلہ میں یہی فیصلہ دیا تھا۔ اہل السنّت کی فقہ فرائض میں پوتی کے متعلق احکام اسی حدیث کی بنا پر بہت پیچیدہ ہو گئے ہیں۔ (۸)

اس واقعہ میں قابل غور بات یہ ہے کہ دونوں صحابیوںؓ میں سے کسی نے بھی پوتی کو اپنے مرحوم باپ کا قائم مقام نہیں بنایا اور ابن مسعودؓ نے جو حصہ دلایا بھی تو ایک اور حیثیت سے۔

(۳) فروع الکافی میں امام جعفر صادقؒ سے ایک روایت منقول ہے جس میں مختلف وارثوں کے متعلق بیان کیا گیا ہے کہ کس کو کس پر ترجیح دی جائے گی' اس میں آیا ہے:(۹)

ابنك اولٰی بك من ابن ابنك و ابن ابنك اولٰی بك من اخيك ...... الخ

''تیرا بیٹا پوتے کے مقابلہ پر اور پوتا بھائی کے مقابلہ پر زیادہ حقدارِ وراثت ہے......''

پھر ان روایات واحادیث میں ہر طرح کی غلطی اور ضعف کا احتمال وامکان تھا' لیکن مقامِ حیرت ہے کہ جہاں ہم دوسرے سینکڑوں معمولی فروعی مسائل پر علمائے امت کو اختلاف کرتے' آثار واحادیث پر نہایت بے باکی سے جرح وتنقید کرتے اور فریق ثانی کی تعبیر وتشریح کو خلافِ عقل ونقل ٹھہراتے دیکھتے ہیں' وہاں اس مسئلہ پر نہ صرف یہ کہ کسی نے آواز ہی نہیں اٹھائی بلکہ کسی کو کبھی اس میں کسی قسم کی غلطی یا خرابی کا شبہ تک پیدا نہیں ہوا۔ کس کس کا حوالہ دیا جائے' جبکہ مخالفت میں کہیں ایک لفظ بھی نہیں ملتا۔(۱۰)

اس ضمن میں' راقم نے خصوصاً ان ائمہ کی طرف رجوع کیا جو اپنے اجتہاد اور عام مسلک سے مخالفت میں خاص شہرت رکھتے ہیں' لیکن اس مسئلہ پر سب کو ہمنوا پایا۔ اس کی صرف ایک بہت بڑی مثال علامہ ابن حزم اندلسیؒ کو لیتا ہوں۔ یہ پانچویں صدی ہجری میں ہوئے ہیں اور انہوں نے تقلید کو بالکل چھوڑ کر اجتہادِ مطلق کا دعویٰ کیا تھا۔ اندلس کے علماء نے اختلافِ رائے کی بنا پر انہیں طعن وایذا کی آماج گاہ بنالیا تھا اور مقامی اُمراء کے دل میں ان کے برخلاف شورش پیدا کر کے انہیں خوفزدہ کرنا چاہا' لیکن وہ کسی سے نہیں ڈرے۔ امام موصوف نہایت تیز زبان تھے اور مخالفین پر جرح کرنے میں بے باک اور سخت گو فقیہ ان سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے۔(۱۱)

دوسرے بے شمار مسائل کے علاوہ خود میراث کے بعض مسائل (مثلاً عول) میں انہوں نے جمہور کے مسلک سے شدید اختلاف کیا ہے(۱۲) لیکن اس مسئلہ کے متعلق نہایت خاموشی اور اطمینان سے لکھ دیا:

ولا یرث مع الابن الذکر احد الا البنات والاب والام و الزوج والزوجة فقط(۱۳)

''بیٹے کے ساتھ مل کر سوائے بیٹیوں' ماں باپ' خاوند یا بیوی اور کوئی وارث نہیں ہوسکتا۔''

اور آگے چل کر صاف لکھتے ہیں:

ولا یرث بنوالابن مع الا بن الذکر شیئًا، اباھم کان اوعمھم، وھذا اجماع متیقن(۱۴)

''بیٹے کے بیٹے (پوتے) بیٹے کی موجودگی میں کچھ بھی نہ پائیں گے' چاہے وہ (بیٹا) ان (پوتوں) کا اپنا باپ ہو یا چچا ہو' اور یہ بات قطعی یقینی اجماع سے ثابت ہے۔''

لیکن یہ اجماع پھر بھی صرف اہل السنّت کے لیے حجت ہوسکتا تھا۔ شیعہ (خوارج اور بعض معتزلہ مثلاً نظام کی مانند) حجیتِ اجماع کے ہی منکر ہیں(۱۵) اور ویسے بھی قانونِ وراثت میں اہل السنّت سے ان کا سخت اختلاف ہے' لیکن اس مسئلہ پر وہ بھی متفق ہیں۔ اگرچہ اس پر پہلے بھی تفصیلاً لکھا جاچکا ہے(۱۶) تاہم مزید قطعیت

اور ''ازالہ شبہات'' کے لیے مندرجہ ذیل اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیں:

فلا میراث لولد ولد مع ولد ذکرا کان اوانثی، حتی انه لا میراث لابن ابن مع بنت، ومتی اجتمع اولاد الاولاد وان سفلوا فاقرب منهم یمنع الابعد ..... ولا یشارك الاولاد فی الارث سوی الابوین والزوجین(۱۷)

''کسی اولاد کی اولاد کو اولاد کے ساتھ وراثت ہرگز نہ ملے گی' چاہے وہ (اولاد) بیٹا ہو یا بیٹی' حتیٰ کہ پوتا بھی بیٹی کے ہوتے ورثہ نہیں پاسکتا۔ اور جب بھی اولاد کی اولاد یا اور بھی نیچے درجے کی اولاد (اپنے سے اوپر کے درجے کی) اولاد کے ساتھ جمع ہو جائے تو زیادہ قریبی دور والے کو محروم کردے گا اور سوائے والدین یا زوجین کے اولاد کے ساتھ اور کوئی وراثت میں شریک نہیں ہوسکتا۔''

الغرض اس تمام مسئلے کا سب سے زیادہ دلچسپ' قابلِ توجہ اور حیران کن پہلو یہی ہے کہ کہیں اس کی مخالفت کا سراغ نہیں ملتا (سوائے موجودہ صدی کے)۔(۱۸)

آخر آج ہمیں یہ قانون کیوں ظلم اور نامعقولیت دکھائی دیتا ہے؟(۱۹) کیا گزشتہ ساڑھے تیرہ سو برس میں امت کے کسی خلیفہ یا امام' کسی مجتہد' محدث' فقیہ' سیاستدان اور کسی فرد میں اتنی عقل اور رحم نہ تھا کہ اسے یہ مسئلہ چبھتا اور وہ اس کے خلاف احتجاج کرتا؟ دوسرے بے شمار مسائل (اور جن میں سے بعض تو مضحکہ خیز حد تک معمولی ہیں) پر تو ہنگامہ آرا تنازعات اور اختلافات عہدِ صحابہؓ سے لے کر آج تک موجود چلے آتے ہیں۔ خود وراثت ہی کے متعلق کئی مسائل میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی (اور بعد میں بھی) اختلاف ہوئے اور ان تمام اختلافات کا ریکارڈ کُتبِ حدیث وفقہ میں مل جاتا ہے۔ لیکن یہی ایسا مسئلہ ہے جس پر گویا کبھی کسی نے کچھ سوچا ہی نہیں۔

پھر یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے کہ زندگی میں شاذ پیش آتا ہو' بلکہ روزمرہ کا معاملہ ہے اور صدیوں تک حکومت وقت کے قانون کی حیثیت سے نافذ رہا ہے۔ اور عدالتوں میں آئے دن اس قسم کے معاملات پیش ہوتے ہوں گے۔ اور پھر بھی کسی آدمی کو نہ اس میں کوئی قباحت نظر آتی ہے' نہ غلطی۔ تمام اُمت کی اس خاموشی کو محض کورانہ تقلید کہہ دینا بھی چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ خصوصاً جبکہ ساتھ یہ دعویٰ بھی کر دیا جائے کہ اس مسئلہ پر تو نص قرآن میں موجود ہے اور آج تک سب ہی اس کی خلاف ورزی کرتے چلے آئے(۲۰) **یا مظهر العجائب والغرائب!** قرآن کا منصوص مسئلہ اور امت میں اس کو سمجھنے والے تیرہ سو سال تک غائب!!!

عقل بسوخت زحیرت کہ ایں چہ بو العجبی ست!

میں کہتا ہوں ـــــ اور ہر غور وفکر کرنے والا مسلمان اسی نتیجہ پر پہنچے گا ـــــ کہ یقیناً کچھ ایسے حالات و وجوہات تھے جن کی بنا پر اس قانون کو مکروہ ومعیوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اور آج جو نقطہ نظر میں تبدیلی آگئی ہے اور جذبات برانگیختہ ہو رہے ہیں' تو اس کے پس منظر میں بدلے ہوئے حالات اور ہمارے مدت سے روبہ الحاد معاشرتی اور اقتصادی نظام کو بھی بڑا دخل ہے۔

افسوس ہے کہ آج تک خاص اس نیت سے ان حالات ووجوہات کا کھوج لگانے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی

ہے، جنہوں نے بظاہر اس قدر ''مذموم'' نظریہ پر حسن وخوبی کے پردے ڈال رکھے تھے۔ لیکن مسئلہ کے اس پہلو پر بھی ایک نظر ڈالنا نہایت ضروری ہے اور اگلے باب میں اسی سے بحث ہوگی۔

حواشی اور حوالہ جات

(۱) صحیح البخاری، ج ٤، ص ٢٨٤۔ وصحیح مسلم، ج ٥، ص ٥٩ اور یہ الفاظ مسلم کے ہیں۔ شیعہ کے نزدیک یہ حدیث ضعیف ہے، دیکھئے تفسیر ابو الفتوح رازی، ج ٣، ص ١٣٣۔

(۲) اس پر مفصل بحث مقالہ ہذا کے دوسرے حصہ میں، باب دوم، فصل اول و دوم میں کی گئی ہے۔ نیز دیکھئے تین اہم مسائل، ص ١٩٥۔١٩٦۔

(۳) صحیح البخاری، ج ٤، ص ٢٨٥۔

(۴) عینی شرح بخاری، ج ٢٣، ص ٢٣٨۔

(۵) النساء: ١١۔ نیز دیکھئے مقالہ ہذا، پہلا حصہ، باب اول کا آخر۔

(۶) صحیح البخاری، ج ٤، ص ٢٨٥۔

(۷) مصادر الاحکام الشرعیہ، ج ٣، ص ١٢٦۔

(۸) جامع الاحکام، ج ١، ص ٦٣۔ نیز دیکھئے مقالہ ہذا، پہلا حصہ، باب چہارم کا آخر۔

(۹) الفروع من الجامع الکافی، ص ٤٣ (یہ کتاب شیعہ کے ہاں وہی درجہ رکھتی ہے جو بخاری اہل السنّت کے نزدیک)۔

(۱۰) نیز دیکھئے مقالہ ہذا کا دوسرا حصہ، باب اول۔

(۱۱) تاریخ فقہ اسلامی۔

(۱۲) دیکھئے المحلی، ج ٩، ص ٢٦٢۔

(۱۳) المحلی ج ٩، ص ٢٧١، مسئلہ نمبر ١٧٢٥۔

(۱۴) المحلی ج ٩، ص ٢٧١، مسئلہ ١٧٢٦۔ نیز دیکھئے احکام القرآن ابن العربی، ١٤٠/١۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ابن حزم مطلق اجماع سے طے شدہ مسائل میں جن کی اصل قرآن وسنت میں نہ ہو، حجیت اجماع کے منکر ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے دلائل کے لیے دیکھئے ان کی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام، ١٢٩/٤۔

(۱۵) اصول التشریع الاسلامی، ص ٣٠۔

(۱۶) مقالہ ہذا، پہلا حصہ، باب چہارم، فصل دوم وسوم۔

(۱۷) کتاب الفرائض من شرائع الاسلام۔

(۱۸) نیز دیکھئے مقالہ ہذا کا دوسرا حصہ، باب اول

(۱۹) مثال کے طور پر دیکھئے تین اہم مسائل صفحہ ١٥٩۔١٦٠ —— دسمبر ١٩٥٣ء کے بعد سے اس مسئلہ پر اخبارات میں جو بحث وتبصرہ شروع ہوا اس میں ہر جگہ مخالفت میں یہی بات دہرائی گئی ہے۔ نیز دیکھئے اس مسئلہ پر پنجاب اسمبلی کی شائع کردہ پبلک آراء خصوصاً اس کے ص ٦١ تا ١٢٠ اور ضمیمہ (سپلیمنٹ) جس میں عوام کے خیالات وآراء کے اکثر حصہ میں اسی بات کا اعادہ ہے کہ ''یہ قانون ظلم ہے اور سراسر نامعقول ہے'' وغیرہ۔

(۲۰) اخبارات کی بحث کے علاوہ پنجاب اسمبلی نے اس مسئلہ پر جو آراء طلب کر کے شائع کی ہیں‘ اس میں ’’خصوصاً عوام کی آراء میں‘‘ بار بار اسی چیز کو دہرایا گیا ہے کہ یہ ’’مسئلہ ظلم ہے۔ قرآن کے برخلاف ہے اور اب قرآن کا اصلی قانون نافذ ہونا چاہیے‘‘۔ ان آراء کے مطالعہ کے بعد آدمی حیران رہ جاتا ہے کہ یا تو علمِ دین اور فہمِ قرآن ہمارے زمانے میں دنیا سے بالکل رخصت ہو چکا ہے‘ یا پھر یہ ’’دروازۂ رحمت‘‘ ہمارے ہی لیے کھلا ہے اور پہلے سب محروم ہی رہے ہے

وکم من عائب قولاً صحیحًا وافتہ من الفہم السقیم

باب ششم

خاموشی کیوں؟

متفرق مطالعہ اور غور و فکر سے اس مسئلہ پر خاموشی کی حسبِ ذیل وجوہ سمجھ میں آتی ہیں:

(۱) عربوں میں زمینوں وغیرہ کی ملکیت کا کوئی دیوانی یا مالیاتی نظام نہ تھا کہ شخص متوفی کے بعد پٹواری اور تحصیل دار وغیرہ کے ذریعے نئے وارثوں کو قانونی حق ملکیت دیا جاتا ہو۔ ہر شخص اپنی شادی شدہ اولاد کو اپنی جائیداد کا کوئی حصہ اس کے گزارہ کے لیے دے دیتا تھا —— (ہمارے دیہاتوں میں آج بھی اس کا رواج ہے۔ گو ملکیت باپ کے نام رہتی ہے‘ لیکن شادی شدہ بیٹے کا پورا حصہ الگ کر کے اسے دے دیا جاتا ہے۔ اگرچہ قانونی طور پر کاغذاتِ مال میں وہ اس حصے کا مالک باپ کی وفات کے بعد ہی بنتا ہے) —— اور اس بیٹے کے اپنے باپ کی زندگی میں مرنے پر بھی اس مال یا زمین کا حق ملکیت دادا کی طرف نہیں بلکہ پوتوں کی طرف منتقل ہو جاتا تھا اور نہ ہی چچا اس کے دعویدار ہوتے تھے‘ کیونکہ ان کے نزدیک تو کسی کا حق تسلیم کر لینا ہی ’’سرکاری فیصلہ‘‘ ہوتا تھا —— غالباً اسلام کے ابتدائی زمانہ میں یہی دستور جاری رہا‘ تا آنکہ بعد میں منظم حکومتیں اور دفاتر قائم ہوئے۔ چونکہ اس طرح بھی یتیم پوتوں کو چنداں نقصان نہیں پہنچتا تھا‘ اس لیے مسئلہ قابل توجہ نہ بنا۔

(۲) اسلام نے فرد کو اپنی جائیداد پر سب سے زیادہ حقوقِ تصرف مثل بیع وہبہ وغیرہ کے دیے ہیں۔ اور نہ تو اس کے اس حق تصرف کو بھاری ٹیکسوں یا عدالتی فیسوں کے ذریعے سے ناقابلِ عمل بنایا ہے اور نہ ہی کوئی فرد اس بنا پر کہ وہ بعد میں جائیداد کا وارث بننے والا ہے‘ اپنے مورث کے حق تصرف کو چیلنج کر سکتا ہے[1]۔ مالک جائیداد اپنی زندگی میں جسے چاہے اور جتنا چاہے با آسانی دے سکتا ہے۔ پھر مسلمان کو وصیت کا حکم ہے[2] خصوصاً اقرباء کے لیے۔ تو ایک سچے مسلمان سے یہ بالکل مستبعد ہے کہ اپنے یتیم پوتوں یا دوسرے محتاج اقرباء کو (جن میں یتیمی اور قرابت —— تبرّع کے دو پہلو موجود ہیں) کچھ دیے بغیر مر جاتے ہوں[3]۔ اس صورت میں بھی کوئی جھگڑا نہیں اُٹھ سکتا۔

یہ ہمارے زمانے کے مسلمانوں کی جہالت کی انتہا ہے کہ وہ اس طرح مال دینے کو بھی گناہ سمجھنے لگے ہیں

جیسا کہ میں نے مقالہ کے مقدمہ میں تحصیل دار صاحب کا واقعہ ذکر کیا ہے' حالانکہ یہ فعل مستحسن ہی نہیں ضروری ہے' بشرطیکہ اس میں کسی کو نقصان پہنچانے کی نیت نہ ہو۔

(۳) اسلام کا ایک مستقل قانون نفقات ہے اور اسلامی عدالت کا فرض ہے کہ وہ ہر شخص کو جو بوجہ صغر سنی افلاس یا نقص اعضاء وغیرہ کسی عارضہ کی وجہ سے دوسرے کا محتاج ہے اس کا نان ونفقہ اس شخص سے دلائے جس پر یہ فرض عائد ہوتا ہے(۴)۔ اس شرعی قانونِ نفقات کی رو سے یتیم پوتے پوتیاں جب تک کہ وہ بالغ نہ ہو جائیں یا اگر ان میں سے کوئی اپاہج وغیرہ ہو تو ان کا نفقہ (گزارہ الاؤنس) بمقدارِ وراثت ان کے چچاؤں پر عائد ہوتا ہے(۵)۔ بلکہ اگر کسی شخص کے اقرباء میں سے کوئی ایسا نہ ہو جس پر اس کا نان ونفقہ لازم قرار دیا جا سکتا ہو تو پھر یہ فرض بیت المال کے ذمے عائد ہوتا ہے(۶)۔ اس قسم کے انتظام اور قانون کے نافذ ہوتے ہوئے بھی یتامیٰ کے لیے کوئی مشکل پیدا نہیں ہو سکتی تھی۔

(۴) اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے کہ وہ اپنی رعایا کی بنیادی ضروریات از قسم مکان' خوراک' لباس مہیا کرنے کے سامان پیدا کرے(۷)۔ مسلمانوں کی اکثر حکومتوں اور خصوصاً دورِ خلافتِ راشدہ میں اس پر عمل ہوتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد میں مسلمان تو مسلمان ذمی ضعیف' معذور اور ناقابلِ روزگار بوڑھوں وغیرہ کے بیت المال سے وظائف مقرر تھے(۸)۔ اور صرف مدینہ کے لوگوں کے جو وظائف اور الاؤنس مقرر تھے اس کی مقدار تین کروڑ سالانہ تھی(۹)—— اور یتامیٰ کے لیے تو بیت المال میں خاص حقوق ہیں(۱۰)۔ یعنی حکومت کے لیے ضروری ہے کہ اپنی طرف سے بے آسرا یتامیٰ کے لیے وظائف مقرر کرے۔ اسلامی حکومتوں میں قاضی (مجسٹریٹ) کے فرائض میں سے تھا کہ وہ اپنے علاقہ (jurisdiction) میں یتامیٰ کے معاملات کی نگہداشت رکھے۔(۱۱)

تجربہ شاہد ہے کہ اگر ایسا انتظام ہو تو یتیم ہونا ''مصیبت'' کی بجائے ایک صفت (qualification) متصور ہونے لگے۔ اس کی ایک مثال ہمارے اپنے زمانے میں ملتی ہے' حکومت نے بھارت سے آنے والے مہاجرین کے لیے گزارہ الاؤنس بھی مقرر کیے تھے۔ اکثر مہاجرین کو دیکھا جو یہ چاہتے تھے کہ زمین وغیرہ چاہے الاٹ ہو یا نہ ہو' گزارہ الاؤنس ملتا رہے' کیونکہ فطرتِ انسانی ''نفع عاجل'' کو زیادہ پسند کرتی ہے۔

(۵) اسلامی قانونِ وراثت میں (جبکہ وہ عملاً صحیح طور پر نافذ ہو) جائیداد صرف باپ یا دادا ہی کی طرف سے حاصل نہیں ہوتی کہ اگر یہ دروازہ بند ہو جائے تو لازماً آدمی بے نوا ہی ہو کر رہ جائے گا' بلکہ اس ہمہ گیر قانون میں ماں' باپ' خاوند' بیوی' بہن' بھائی' چچا وغیرہ سب ہی ذریعہ وراثت ہو سکتے ہیں۔ اور یہ بالکل ناممکن ہے کہ کوئی شخص سب کی طرف سے ہی وراثت سے محروم ہو جائے۔ رہا بعض اوقات کسی خاص طرف سے محجوب ہو جانا تو یہ حالت صرف پوتے کے ساتھ مخصوص نہیں ہے' بلکہ چھ اصلی وارثوں کے علاوہ باقی ہر شخص حجب حرماں کی زد میں آ سکتا ہے—— اور یہی غالباً سب سے بڑی وجہ ہے کہ کسی کو خاص پوتے کے محجوب ہونے میں کوئی نامعقولیت

نظر نہ آئی۔ (۱۲)

پھر جن صورتوں میں یتیم پوتا محجوب ہو جاتا ہے' ضروری نہیں کہ ہر حالت میں وہ قابلِ رحم ہی ہوتا ہو۔ کئی صورتوں میں اسے ماں کی طرف سے باپ کی نسبت بھی زیادہ جائیداد مل سکتی ہے۔ کتنی دفعہ بالغ اور صاحبِ اولاد و جائیداد پوتے ہو سکتے ہیں۔ بعض دفعہ دادا جائیداد نہیں بلکہ قرضے چھوڑ کر مرسکتا ہے جن کی ادائیگی اس صورت میں چچا پر واجب ہوگی۔ اکثر صورتوں میں یہ بھی ممکن ہے کہ خود چچا ہی اس سے کم سن اور مفلس رہ گیا ہو۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خود یتیم کا باپ اس قدر دولت چھوڑ مرا ہو جو اس کے دادا کو کبھی نصیب نہ ہوئی ہو۔ الغرض ''یتیم'' کے ساتھ ہی ایک ''انگوٹھا چوستے ہوئے لاوارث بچے کا تصور'' حقائق سے زیادہ جذبات پر مبنی ہے۔ اب رہا بعض دفعہ ''قابلِ رحم'' ہونا تو اس میں یتیم پوتے کے ساتھ بیوہ بہن' نادار بھائی اور مفلس چچا بھی شریک ہیں۔ لہٰذا پوتے کو بالخصوص ''ہدفِ ستم'' سمجھنے کی کوئی خاص وجہ ذہن میں نہیں آسکتی تھی۔

(۶) معلوم ہو چکا ہے کہ یہ مسئلہ عہدِ صحابہؓ سے چلا آرہا ہے اور ہر مذہب فکر کے فقہاء نے اس پر اجماع کر لیا تھا۔ اور کتاب وسنت پر ایمان' اجماع کا احترام اور ماہرینِ فن کی تحقیق پر اعتماد اس زمانے کے مسلمانوں کا طرۂ امتیاز تھا۔ امت کے بہترین دماغوں کا کسی مسئلہ پر متفق ہو جانا ان کے نزدیک سب سے بڑی حجت تھی (۱۳)۔ اور اس کے بعد ان کے ذہنوں میں کسی اعتراض کا ابھرنا ہی دشوار تھا۔

(۷) اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے اور اس کا ایک مجموعی مزاج ہے جو تقسیم ہو کر قائم نہیں رہ سکتا۔ اس کے اجزاء کو پارہ پارہ کر کے نہ تو ان کے بارے میں جداگانہ رائے زنی درست ہوسکتی ہے' نہ کسی دوسرے نظامِ زندگی کے اندر اس کے کسی جزء یا اجزاء کو پیوست کر کے کوئی مفید نتیجہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کا ہر جزء دوسرے اجزاء کے ساتھ اس طرح جڑا ہوا ہے کہ ان کے ساتھ مل کر ہی کام کرسکتا ہے اور اس کی خوبی یا قباحت کے متعلق صحیح رائے اسی وقت قائم کی جاسکتی ہے جبکہ پورے نظامِ اسلامی کے تناسب اور عمل میں اسے کام کرتے ہوئے دیکھا جائے۔ قانونِ وراثت اسلامی نظامِ حیات کا ایک جزء ہے اور اس نظامِ حیات کا اپنا ایک مخصوص نظامِ معیشت' نظامِ معاشرت' نظامِ اخلاق' نظامِ حکومت اور نظامِ تعلیم وتربیت ہے اور قانونِ وراثت کے ساتھ ساتھ اس کا اپنا قانونِ ہبہ' قانونِ وصیت اور قانونِ نفقات بھی ہے' اور ان سب کا ساتھ ساتھ اجتماعی زندگی میں نافذ ہونا اور کام کرنا ضروری ہے۔ اس کا اندازہ اس سے بھی ہوسکتا ہے کہ قرآنی احکامِ وراثت اس وقت نازل اور نافذ ہوئے جب ایک مکمل اسلامی نظام اور ایک مثالی اسلامی معاشرہ مضبوط بنیادوں پر قائم ہو چکے تھے۔ ایسے تربیت یافتہ معاشرہ میں یتامیٰ کے لیے مشکلات کا پیدا ہونا ہی مستبعد معلوم ہوتا ہے —— اور غالباً یہی وجہ ہے کہ اس مسئلہ پر تعجب' حیرت' نفرت اور تنقید کی تاریخ اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب اسلامی نظام کی تمام کڑیاں ٹوٹ پھوٹ چکی تھیں اور اکیلا نیم جان قانونِ وراثت نظامِ اسلامی کے دیگر اجزاء کے ہجر میں سوگوار رہ گیا اور خود بھی قابلِ ماتم نظر آنے لگا۔

کم از کم برصغیر پاک و ہند میں یہ مسئلہ (یعنی اس پر اعتراضات) انگریزی اقتدار کے بعد ہی پیدا ہوا ہے جس میں مدت تک قرآن کے مقرر کردہ چھ اصلی اور لازمی وارثوں (بیٹا، بیٹی، ماں، باپ، بیوی، خاوند) میں سے پانچ کو نظر انداز کر کے ہندو رواجی قانون کے مطابق صرف ایک قسم یعنی بیٹوں اور ان کی اولاد کو حصہ دیا جاتا رہا[۱۴] اور بدلے ہوئے ماحول اور غیر اسلامی معاشرت و معیشت نے اس رواج کو قانونِ شرعی کے مقابلے پر زیادہ پسندیدہ اور جاذبِ نظر بنا دیا۔ یہ اسی رواج کی محبت اور قانونِ شرعی سے عملی بُعد اور لاعلمی کا نتیجہ ہے کہ آج عام مسلمانوں کو —— یتیم پوتے کا اپنے چچا کی موجودگی میں دادا کی جائیداد سے حصہ نہ پا سکنا اور کسی نوجوان بے اولاد بیوہ کو اس کے خاوند کی جائیداد سے (نکاحِ ثانی پر پابندی لگائے بغیر بلکہ اس کی اجازت دے کر) حصہ ملنا —— دونوں فعل یکساں نامعقول اور لغو دکھائی دیتے ہیں۔

چنانچہ اگلے حصے میں یتیم پوتے کے محجوب الارث ہونے کے مسئلہ کے اس نئے پہلو یعنی اس پر اعتراضات، ان کے محرکات اور پیش کردہ اصلاحات و ترمیمات اور ان کے مضمرات پر تنقیدی نظر ڈالیں گے۔

(جاری ہے)

حواشی اور حوالہ جات

(۱) ہمارے رواجی قانون اور اسلامی قانونِ وراثت کے اس لحاظ سے تقابل کے لیے دیکھئے رسالہ ''یتیم پوتے کا حق وراثت'' از سید غلام احمد پلیڈر منٹگمری، ص ۱۳۔۱۴۔

(۲) اس پر مفصل بحث مقالہ ہذا کے اگلے حصہ میں آ رہی ہے۔

(۳) کتب فتاویٰ میں پوتوں کے متعلق وصیت کے بعض خاص پیچیدہ سوال ملتے ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ لوگ کس طرح وصیت کرتے تھے جس سے پوتے کو حصہ بھی بیٹے کے برابر مل جائے اور وصیت بھی $\frac{1}{3}$ سے زیادہ نہ ہو۔ مثلاً ایک آدمی مر گیا، اس نے چھ بیٹے، ایک پوتا اور ایک پوتی چھوڑی اور وصیت یہ کی کہ پوتے کو ایک بیٹے کے حصے کے برابر ملے اور پوتی کو $\frac{1}{3}$ حصہ جائیداد میں سے پوتے کا حصہ نکالنے کے بعد بقایا کا $\frac{1}{3}$ ملے۔ اب تقسیم ورثہ کیوں کر ہو؟ جواب: ہر ایک بیٹا $\frac{2}{15}$، پوتا بھی $\frac{2}{15}$ اور پوتی $\frac{1}{15}$ لے گی۔ (دیکھئے مجموعہ فتاویٰ ابن تیمیہؒ ج ۴، ص ۳۷)

(۴) فتاویٰ عالمگیری، ج ۲، ص ۶۱۸۔

(۵) فتاویٰ عالمگیری، ج ۲، ص ۶۰۷ بلکہ باپ کے مفلس ہونے کی صورت میں بھی پوتوں کا نفقہ عدالت دادا پر واجب کر سکتی ہے —— ایضاً۔

(۶) فتاویٰ عالمگیری، ج ۲، ص ۶۱۸۔

(۷) اسلام کا اقتصادی نظام، ص ۴۵ (بحوالہ المحلّٰی ابن حزمؒ) نیز اسی کتاب کا صفحہ ۱۲۹ اور ۱۳۹ تا ۱۵۶۔

(۸) الفاروق، ص ۱۵۷ بحوالہ کتاب الخراج۔

(۹) الفاروق، ص ۷۷ بحوالہ یعقوبی۔

(۱۰) احکام القرآن للجصاص، ج ۲، ص ۶۷ اور اصل تو اس بارے میں قرآن کا حکم صریح موجود ہے، دیکھئے

الانفال:۴۱والحشر:۷ —— یہاں یہ بیان کر دینا ضروری ہے کہ دورِانحطاط میں مسلمان حکمرانوں نے تو اپنے اس قسم کے فرائض سے روگردانی اور تغافل شروع کر دیا' لیکن غیر مسلم حکومتوں نے اس قسم کے قوانین اپنانے شروع کر دیے۔ انگلستان میں اٹھارہویں صدی کے بعد Poor Law اور بعد میں Social Security Act نافذ ہوئے۔ جرمنی میں متعدد قسم کی پنشنیں اور الاؤنس اور سرکاری گھر (Shelter Homes) وغیرہ رائج ہوئے۔ تفصیلات کے لیے کیمبرج کی ''تاریخ یورپ'' اور امریکن فاضل E.M. Burns کی کتاب "American Social Security System" ملاحظہ فرمائیں۔

(۱۱) Muslim Institutions Page148۔ ویسے اسلامی فقہ یا سیاسیات کی ہر کتاب میں جہاں جہاں بھی ''منصبِ قضاء'' سے بحث کی گئی ہے' یہ بات بیان کی گئی ہے۔ اس وقت یہی حوالہ مستحضر تھا۔

(۱۲) نیز دیکھئے غلام دستگیر نامی کا مکتوب مطبوعہ اخبار نوائے وقت لاہور مورخہ ۱۷ دسمبر ۱۹۵۳ء صفحہ ۳' کالم ۵'۶'۷۔

(۱۳) اور یہ بہت بڑی ناانصافی بلکہ جہالت ہے کہ اکابر مجتہدین امت کے متفقہ فیصلوں کے اتباع اور جاہل آباء کی کورانہ تقلید میں کوئی فرق روا نہ رکھا جائے اور سب کو ایک ہی لکڑی سے ہانک دیا جائے۔

(۱۴) لارڈ ولیم بنٹنگ کے عہدِ گورنری (۱۸۲۸ء تا ۱۸۳۵ء) میں مسلمانانِ ہند کے تمام آئین وقوانین طاقِ نسیاں پر رکھ دیے گئے۔ اس کے قریباً پچاس برس بعد بنگال اور مدراس کی صوبائی حکومتوں نے اصلاحِ احوال کی کچھ کوشش کی' لیکن تمام نظام اس قسم کا ہو چکا تھا کہ یہ تدبیریں مؤثر ثابت نہ ہو سکیں۔ (دیکھئے جامع الاحکام' ج ۱' ص ۲)۔

❁❁❁

بقیہ: فہم القرآن

مِنَ الَّذِیْنَ : ان لوگوں میں سے	اُوْتُوا : جن کو دی گئی
الْکِتٰبَ : کتاب	حَتّٰی : یہاں تک کہ
یُعْطُوا : وہ دے دیں	الْجِزْیَةَ : جزیہ
عَنْ یَّدٍ : ہاتھ سے	وَّ : اس حال میں کہ
هُمْ : وہ لوگ	صٰغِرُوْنَ : چھوٹے ہونے والے ہیں

نوٹ ۱: ابتداءً جزیہ کا حکم یہود و نصاریٰ کے لیے تھا' لیکن آگے چل کر نبی اکرم ﷺ نے مجوس سے جزیہ لے کر انہیں ذمّی بنایا۔ پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بیرونِ عرب کی تمام قوموں پر اس حکم کو عام کر دیا۔ (تفہیم القرآن)

نوٹ ۲: جزیہ ادا کرنے سے غیر مسلم رعایا کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری اسلامی حکومت پر عائد ہو جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں کچھ رعایتیں بھی حاصل ہو جاتی ہیں۔ مثلاً اسلامی ریاست میں لازمی فوجی خدمت سے یہ لوگ مستثنیٰ ہوتے ہیں۔ اسلام کے مالی احکام بھی ان پر لاگو نہیں ہوتے' مثلاً زکوٰۃ' عُشر' فطرانہ' قربانی وغیرہ۔

❁❁❁

تعارف وتبصرہ

تبصرہ نگار: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

نام کتاب : اسلام اور جمہوریت

مصنف : مولانا ابوالکلام آزاد

ضخامت:110 صفحات قیمت:200 روپے

ناشر: مکتبہ جمال' حسن مارکیٹ' اردو بازار' لاہور

کتاب کے مصنف مولانا ابوالکلام آزاد کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ اُن کا نام ہی ان کا تعارف ہے۔ انہوں نے مختصر الفاظ میں اسلامی نظام کو جمہوری نظام ثابت کیا ہے۔ ہر قوم جمہوریت کے لفظ کو پسند کرتی ہے کہ اس میں عوام الناس کو اہمیت دی گئی ہے۔ مگر یہ صرف الفاظ تک محدود ہے۔ کیونکہ جمہوریت تو حکمران کو یہ حق نہیں دیتی کہ وہ بادشاہ ہو اور اُس کی بود و باش شاہانہ ہو۔ اسلامی نظام حکومت ہی ایسا نظام ہے جس پر جمہوریت کا لفظ صادق آتا ہے۔ کیونکہ اس میں حکمران کو عوام الناس پر کسی طرح کی برتری حاصل نہیں ہوتی' وہ صرف نظامِ عدل وانصاف رائج کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

اسلامی حکومت کا سربراہ عوام کی رائے سے منتخب ہوتا ہے۔ اس کو رعایا کے کسی عام انسان پر کوئی برتری نہیں ہوتی۔ جمہوریت کے قیام کے لیے قرآن مجید میں اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ کے الفاظ آئے ہیں' جس سورۃ میں یہ الفاظ آئے ہیں اس کا نام ہی ''الشوریٰ'' یعنی مشورہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلی اسلامی حکومت قائم کی' مگر آپؐ کی گزر بسر رعایا کے ایک عام آدمی ہی کی طرح تھی' بلکہ اس سے بھی کمتر۔ اسی طرح آپ ﷺ کے بعد آپؐ کے خلفاء کا بھی یہی انداز تھا۔ نہ آپؐ نے اپنے کسی عزیز کو اپنا جانشین مقرر کیا نہ آپؐ کے خلفاء نے ایسا کیا' بلکہ حکمران کا انتخاب جمہور کی رائے سے ہی ہوا۔ اسلامی سلطنت کے حکمران کو خلیفہ کہا جاتا ہے' یعنی اُس کی ذمہ داری ہے کہ قرآن وسنت کے احکام عوام پر انصاف کے ساتھ نافذ کرے اور خود بھی ان کا پابند ہو۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلامی جمہوری نظام خلافت راشدہ تک ہی محدود رہا۔ اس کے بعد مسلمان حکمرانوں نے بھی اپنے آپ کو عوام الناس سے برتر سمجھا' اقتدار کے نشے میں عیش وعشرت اور کمزوروں پر ظلم کی داستانیں رقم کیں۔ اسلامی جمہوری نظام وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے بعد آپؐ کے اصحاب نے رائج کیا اور اپنے آپ کو عام آدمی کے سامنے بھی مسئول جانا۔

کتاب بقامت کہتر وبقیمت بہتر کا مظہر ہے۔ جلد مضبوط اور ٹائٹل دلکش ہے۔

(۲)

نام کتاب : فیضان حقانی

مصنف : مولانا محمود الرشید حدوٹی

ضخامت: 163 صفحات قیمت: درج نہیں

ناشر: القاسم اکیڈمی، جامعہ ابوہریرہ، خالق آباد نوشہرہ

ملنے کے پتے : (۱) جدید مکتبہ رشیدیہ محلّہ جنگی پشاور

(۲) ادارہ آبِ حیات غوث گارڈن-2، جی ٹی روڈ مناواں، لاہور

کتاب کے مصنف مولانا محمود الرشید حدوٹی جامعہ اشرفیہ لاہور کے فاضل اور سابق مدرس ہیں۔ معروف عالمِ دین اور ۸۰ سے زیادہ قابلِ قدر کتابوں کے مصنف ہیں۔ ماہ نامہ آبِ حیات گزشتہ سترہ سال سے ان کی ادارت میں شائع ہو رہا ہے۔ مولانا حدوٹی تبصرہ نگاری میں مہارت رکھتے ہیں۔ وہ مولانا عبدالقیوم حقانی کی تصنیفات اور تالیفات پر ماہرانہ تبصرے رقم کرتے رہے ہیں۔ اس کتاب میں انہوں نے وہ تمام تبصرے یکجا کر کے حروف ابجد کی ترتیب سے شائع کر دیے ہیں۔ کچھ تبصرے چند دیگر علماء کی کتابوں پر بھی ہیں جو اس کتاب میں شامل کر دیے ہیں۔ کتابوں پر تبصرے کے علاوہ چند مکاتیب بھی یہاں درج ہیں جو مولانا عبدالقیوم حقانی نے وقتاً فوقتاً محمود الرشید حدوٹی کو لکھے تھے۔

اس کتاب میں سو (۱۰۰) سے زائد کُتب پر تبصرے شامل ہیں۔ اکثر تبصرے مختصر ہیں، اگرچہ تمام تبصرے ماہرانہ قلم بند کیے گئے ہیں۔ تاہم شیخ الحدیث مولانا عبدالقیوم حقانی کی شرح مسلم شریف کی دس جلدوں اور مقدمہ شرح مسلم پر الگ الگ تبصرے قابلِ ذکر ہیں۔ کتاب کے اخیر میں مولانا حدوٹی کی تصنیفات کی فہرست بھی دی گئی ہے۔ کتاب کا ٹائٹل خوبصورت اور دلکش ہے۔ کاغذ سفید اور جلد مضبوط ہے۔

❁❁❁

شرک کی حقیقت، اقسام اور دورِ حاضر
کے شرک سے واقفیت کے لیے مطالعہ کیجیے

حقیقت و اَقسامِ شرک

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

اشاعت خاص 100 روپے، اشاعت عام 60 روپے

MESSAGE OF THE QUR'AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

Surah Al-An'am

(The Cattle)

(Recap of verses 21 – 41 of Surah Al-An'am and fresh exposition of verses 42 – 55 of the same Surah, inclusive)

Translator's note:

For the sake of continuity and coherent explanation, most of the general discourse has been made by employing the 'male' as a prototype, which is in no way meant to be diminutive of the opposite gender or to disrespect the status of women.

Moreover, each verse (Ayah) has been kept as a continuum in order to prevent the misrepresentation of meanings, which may occur when the verses are broken up and the translation of those verses becomes kaput when done in bits and pieces.

Cross-references taken from other parts of the Qur'an and the Hadith of the Messenger of Allah (SAAW) are provided in italics.

The Translation of the Holy Qur'an done by the Message International – USA (www.FreeQuran.com) and edited by Saheeh International – UK, Dar Al Mountada – Saudi Arabia and Al Qummah – Egypt has been used in order to synchronize the use of modern English Language, which we believe will give a more accomplished sense of understanding to Today's mind.

Recap of verses 21 – 41 (inclusive) of Surah 6, Al-An'am

- ***The subject matter of verses 21 through 26 is that prejudice and arrogance has made the people worship deities other than Allah (SWT).***

These verses refer from the very onset to the fact that those who falsely assert that there are also other beings who share with Allah *(SWT)* in His *(SWT)* Godhead and hence 'rightly' deserve to claim from man worship and absolute service, are in fact stranded on the path of grave disbelief and evil.

The phrase 'signs (verses) of Allah *(SWT)*' used in these verse refer to the signs found within man's own being, as well as those scattered throughout the universe. They also include the signs which are manifest from the lives and achievements of the Prophets *(AS)*, as well as those embodied in the Divine Scriptures. All these point towards one and the same truth - that in the entire realm of existence there is one Allah *(SWT)* alone and that everything else – living, non-living and whatever lies in-between, is merely His *(SWT)* Creation and, hence His *(SWT)* subject(s), servant(s) and slave(s).

The verses declare that denying what should be affirmed and fabricating a lie on Allah *(SWT)* are two of the deadliest sins that are similar in nature. The unbelievers had the false faith that their fabricated deities, other than Allah *(SWT)*, which they worshipped and invocated would save them from the punishment and torment of the Hellfire. The verses tell us that on the very first manifestation of Allah's *(SWT)* torment on the Day of Judgement, the unbelievers and infidels will deny and later forget their most cherished beliefs – that those false 'associates' and 'deities' are their saviours. That is because those false 'partners' would be nowhere to be seen because they never existed in the first place, as it was a lie fabricated by the unbelievers. The unbelievers and polytheists will be at a total loss of argument and will consequently be cast into the Hellfire

It is also noteworthy that in these verses, Allah *(SWT)* attributes all that happens in the world as a result of the laws of nature to Himself *(SWT)*. Since these laws were made by Allah *(SWT)* Himself *(SWT)*, the effects which result from their operation are also ultimately due to the Will and Permission of Allah *(SWT)*. The refusal on the part of unbelievers to heed to the call of the Truth, even when it is clear and audible, stems from their arrogance, prejudice and ego-driven mental rigidity. When Allah *(SWT)* describes that particular scenario, He *(SWT)* does so by saying that He *(SWT)* has 'sealed the heart of such people'. Unlike humans, who describe merely an incident, Allah *(SWT)* describes its root cause and ultimate effect.

The verses also reject the argument made by disbelievers that there is nothing novel about the Divine Message revealed in the Qur'an, through the

Last Messenger *(SAAW)* and that it is merely a repetition of things that have come down from the past, by making it abundantly clear that the Truth has always been one and the same and will remain so. Thus, according to the Sunnah of Allah *(SWT)* when people deny the call of the prophet *(SAAW)* because of their sheer arrogance and treachery, Allah *(SWT)* quenches their abilities and judgements.

The verses conclude by warning those of a great torment who make every possible effort to stop the ones who are curious to find and embrace the straight path. Those doing such wicked acts, due to their evil attitude and disbelief are, in fact, storing for themselves the torment of the Hellfire.

- ***The central theme of verses 27 through 32 is the absolute certainty of 'Life after Death' and the fate of disbelievers at that point.***

This section of verses starts with the indication that on the Day of Judgements when all veils will be lifted and the Truth would become clear to everyone, believers and disbelievers alike, the latter would be devastated and would seek to find a way to redeem themselves. They would be so distressed by the thought of the torment of the Hellfire awaiting them that they would ask (as a wish to) Allah *(SWT)* to give them "one more chance" and to send them back to the worldly life, so that they could live as believers.

The verses then verse elucidate that at that moment of truth (when the unseen would be unveiled) such a statement on their part would not be indicative of either any true change of heart or of any genuinely revised judgement based on serious reflection and reasoning. It would rather be the result of direct observation of reality at a time when even the staunchest unbeliever would find it impossible to deny it. Additionally, it would only be a claim made in distress of the ominous Hellfire with all its torments in store.

The verses in this section of the Surah provide a snapshot of the different types of disbelief in that age and we find that almost all of them are seen even today in some shape or form. These include outright disbelief, atheism and agnosticism.

The verse gives a taste of things to come for the unbelievers and also throws light on the "finale" of the Day of Judgement. Once the unbelievers will run out of all arguments and they will be forced near the Hellfire, they would be asked about the "Truth" – something that they consistently used to deny in their worldly life. They would say that verily it is the Truth, but their testimony at that time would amount to nothing. The disbelievers would then be cast into the Hellfire – the same one that they used to deny in their worldly life.

In a nutshell, this section of the Surah portrays a picture of the sheer disappointment, regret, fear and anguish that the unbelievers will experience when the Hour approaches, ushering in the Days of Judgement and Resurrection. The verses call the disbelievers as "losers", as they denied any accountability or meeting with Allah *(SWT)* after death according to the false beliefs that they held in the worldly life. The verse also explains that the unbelievers would not have any chance of redemption as their worldly life would come to an abrupt end, whether it is because of individual deaths or 'the Hour' has arrived.

It must be understood that the underlying message in this section of the Surah is not that earthly life has nothing serious about it and that it has been brought into being merely as a sport and pastime. *(**Note**: This caution, "The life of this world is nothing but a sport and a pastime" has been repeated in Surahs, Ankaboot: 64, Sad: 4, Muhammad: 36 and Hadeed: 20)* What the observation made in these verses really means is that, compared with the true and abiding life of the Hereafter, earthly life is merely a transient phase, yet extremely important as whatever one sows here would be reaped in the Hereafter.

- ***Verses 33 through 35 make it abundantly clear that those who deny Prophet Muhammad (SAAW), in fact deny Allah's (SWT) revelations.***

Before Prophet Muhammad *(SAAW)* began to preach the message of Allah *(SWT)*, people at large from the extended tribe of Quraish regarded him *(SAAW)* as truthful and trustworthy and had full confidence in his *(SAAW)* veracity. Only after he *(SAAW)* had begun to preach the message of Allah *(SWT)* did they call him *(SAAW)* a liar **(Editor's Note: *We recuse ourselves of such blasphemous allegations)***. Still, during this period none dared to say that the Prophet *(SAAW)* had ever been guilty of untruthfulness in personal matters. Even his *(SAAW)* worst enemies never accused him *(SAAW)* of lying. When they did accuse him *(SAAW)* of falsehood **(Editor's Note: *We recuse ourselves of such blasphemous allegations)***, they did so in respect of his *(SAAW)* prophetic mission.

This section of the Surah commences with Allah *(SWT)* consoling the Prophet *(SAAW)* by telling him *(SAAW)* that by untruthfully charging him *(SAAW)* with falsehood, the unbelievers were actually calling Allah *(SWT)* untruthful. Since Allah *(SWT)* has endured this accusation with mild forbearance, leaving them free to persist in their blasphemy, the Prophet *(SAAW)* need not feel undue disquiet. Moreover, Allah *(SWT)* says to the Prophet *(SAAW)* that He *(SWT)* knows well whatever the disbelievers demand from him *(SAAW)* and whatever they deny from his *(SAAW)* miracles grieves him *(SAAW)*.

Verse 34 of this Surah serves as a point of climax of this section of the Surah. It clearly identifies the root cause of the disease in the hearts of the disbelievers as well as their consequential wicked actions.

The major point emphasized in these verses is that no one has the power to change Allah's *(SWT)* Law regarding the conflict between Truth and falsehood. Lovers of Truth must necessarily pass through trials and persecution so as to be gradually tempered. Only after they have established their moral superiority over their adversaries will Allah's *(SWT)* help arrive.

The verses also outline the divinely specified course which has to be followed by Prophet Muhammad *(SAAW)* as he *(SAAW)* has been appointed a Messenger *(SAAW)*. Phases of this course of action include bearing the opposition patiently and this phase is surely not novel as the Prophet *(SAAW)* had been told this at various other places in the Qur'an regarding the difficult lives and hardships faced by all Prophets *(AS)* who came before him *(SAAW)*.

Moreover, Allah *(SWT)* tells His *(SWT)* beloved Messenger *(SAAW)* in these verses not to be impatient. The Prophet *(SAAW)* is told to persist in his *(SAAW)* striving and continue to work, in conformity with Allah's *(SWT)* directives. Had it been Allah's *(SWT)* purpose to work miracles, He *(SWT)* would have done so. But Allah *(SWT)* did not consider that to be either the appropriate method for bringing to a successful completion the required intellectual and moral revolution or for the evolution of a sound, healthy civilization. Moreover, Allah *(SWT)* tells His *(SWT)* beloved Prophet *(SAAW)* that even the most vivid of miracles or tangible signs of Allah *(SWT)* would not change the unbelief of the unbelievers into belief, unless Willed by Allah *(SWT)*. The Holy Prophet *(SAAW)* is directed that he *(SAAW)* should not expect Allah *(SWT)* to fulfil his *(SAAW)* wish, as such phenomena have no place in Allah's *(SWT)* Grand Scheme of things. Had it been Allah's *(SWT)* Will that all people should be driven to the Truth, there would have been no need to send Prophets *(AS)*, to reveal divine Scriptures, to direct believers to engage in struggles against unbelievers, and to make the message of Truth pass through the necessary stages until fulfilment is reached. The result could have been achieved by a single sign of Allah's *(SWT)* Will of "Kun" (Be). Allah *(SWT)* has created man as a responsible being, bestowed upon him a degree of latitude that he may exercise, granted him the freedom to choose between obedience and disobedience to Allah *(SWT)*, awarded him a certain term of life in order to demonstrate his worth, and determined that at an appointed Hour He *(SWT)* will judge him for either reward or punishment in the light of his deeds.

- ***Verses 36 through 41 focus on the fact that those who listen sincerely to Allah (SWT) and His (SWT) Messenger (SAAW) will accept the Truth***

about Islam. Moreover, these verses demand of humans to use common sense and rational faculty to learn the Truth of Islam from the signs of nature and testify that all people, even the disbelievers, eventually supplicate to Allah (SWT) alone when they are in real distress.

The verses elucidate that those who do not heed to the message contained in the Divine Revelation are, in fact, "dead" and they spend their worldly life in disbelief and falsehood.

The verses use commonly observed phenomena to develop an irrefutable argument of Allah's *(SWT)* authority over all things, alone. If the unbelievers are concerned with miraculous signs in order to determine whether or not the message of the Prophet *(SAAW)* is indeed true, then, let them look around with open and attentive eyes. If they actually do so they will find the world full of such signs.

The verses also emphasises that although animals, birds and insects have their own ways and systems, the ultimate Designer, Enforcer and Maintainer of those ways and systems is Allah *(SWT)* alone and to Him *(SWT)* will they all return on the Day of Judgement for accountability.

The verses clarify that Allah's *(SWT)* "act" of misguiding a person consists in not enabling one who cherishes being arrogant, treacherous and ignorant to observe the signs of Allah *(SWT)*. The fact is that if a biased person – one who has no real love of the Truth – were to observe the signs of Allah *(SWT)*, he might still fail to perceive them. Indeed, all those things which cause misconception and confusion would probably continue to alienate him from them. Allah's *(SWT)* "act" of true guidance consists in enabling a seeker of the Truth to benefit from the sources of true knowledge, so that he constantly discovers sign after sign, leading him ultimately to the Truth. These verses allude to this basic reality of the striving of people for Truth vs falsehood and the implications of both thereof, and this section of the Qur'an employs a myriad of cases that humans encounter on a daily basis to illustrate this phenomenon.

The verses also refer to a common observation that whenever the infidels are confronted with a difficulty, as in a sea storm or a life threatening situation, they tend to lose the respect for their deities and cried for Allah's *(SWT)* help. Similarly, when either some great calamity befalls a person or when death starkly stares in the face, it is only to Allah *(SWT)* that the person turns to for refuge. On such occasions even the staunchest polytheists forget their false gods and cry out to the One True God – Allah *(SWT)*, and even the most rabid of atheists stretch out their hands in prayer to Him *(SWT)* (although those watching may not be aware of this happening at the time of death, as

the veil is lifted only for the person dying and not for others). This phenomenon is mentioned here in order to draw an instructive lesson. It shows that devotion to Allah *(SWT)* and monotheism are ingrained in the human soul. No matter how overlaid this truth might be with darkness, some day it shakes off man's heedlessness and ignorance and manifests itself fully, potentially in this world and certainly at the time of death for all.

==========

Exposition of verses 42 - 55 of Surah Al-An'am

Verse 42

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ۝

"And We have already sent [messengers] to nations before you, [O Muhammad]; then We seized them with poverty and hardship that perhaps they might humble themselves [to Us]."

In this verse, the Qur'anic word */**ba'sa'**/* has been applied in the senses of difficulties, fight (jihad/qitaal), poverty, famine, flood, earthquake, and infectious diseases; and the Arabic term */**darra'**/* has been used in the Qur'an at various places with the meanings of sorrow, grief, disgrace, ignorance, and failure.

The verse alludes to the fact that the appointment of prophets *(AS)*, of course, and completing the argument (of Truth prevailing over all rivals) has been a process and a Divine way of treatment (The Sunnah of Allah *SWT*) in the length of history. So, the history of the past is an example for the coming generations.

Moreover, these 'difficulties' and 'trials' are in various cases a means to make human beings mature and ready to recognize, revere and worship Allah *(SWT)* and also a Divine system for managing the transgressors.

Therefore, neither any welfare is a grace nor any difficulty is a wrath. At the time of calamities, the hands are raised up for supplication to Allah *(SWT)* and for asking His *(SWT)* help and bounty.

Moreover, this verse also explains the Divine Law of wrath regarding disobeying a Messenger *(Rasul)* as opposed to a Prophet *(Nabi)*. Whenever a messenger is sent to a nation, Allah *(SWT)* puts the nation on a trail through calamities. These calamities are helpful in bringing them out of their ignorance.

However, in the case that a nation fails to respond and refutes the messenger *(AS)* and rejects his *(AS)* message, Allah *(SWT)* prolongs their 'career of crime and sin' before a massive torment afflicts them.

That torment is sufficient for erasing them off from the face of the Earth!

Verse 43

فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝

"Then why, when Our punishment came to them, did they not humble themselves? But their hearts became hardened, and Satan made attractive to them that which they were doing."

The verse declares that to be heedless unto divine warnings and not to be regardful is a sign of hard-heartedness.

It is for this reason that the verse implies why then the disbelievers do not take counsel from these painful and awakening factors and warnings, and why do they not awaken from the sleep of negligence, and return towards the bounty of Allah *(SWT)*.

The verse goes on to explain that, in fact, their unawareness and dissent was due to two reasons. Firstly, as a result of 'extravagance' in committing sin and persisting in disbelief, their hearts became dark and hardened, and their souls changed became inflexible and heedless to the Truth.

The second factor was that by blindly following their desires, (particularly with regards to their animal instincts of relentless pursuit of sensuality), Satan made their deeds seem decorous to them. So, they considered that right whatever wrong they did, and counted aright and correct every offence they committed.

What followed, the verse explains, that the wrath of Allah *(SWT)* engulfed them.

Verse 44

فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ؕ حَتّٰٓى اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ۝

"So when they forgot that by which they had been reminded, We opened to them the doors of every [good] thing until, when they rejoiced in that which they were given, We seized them suddenly, and they were [then] in despair."

The Arabic term ***/'ilas/*** in this verse means a grief accompanied with despair. It is a status and a feeling that criminals endure in any court of law when they cannot find an answer to offer.

Wellbeing, affluence and welfare in this worldly life may not always be a sign of mercy from Allah *(SWT)*. On the contrary, it is sometime the cause of chastisement, as mentioned in the verse.

Giving respite to evildoers and preparing welfare and comfortable life for offenders, before abruptly replacing it with the opposite, is one of Allah's *(SWT)* way of treatment (The Sunnah of Allah *SWT*). The world and its bounties can be both a favour and a source of indignation and curse. It depends to whom they are given and the way they are used.

In this, the world has been counted as a divine blessing, yet at the same time the verse also brings forth the fact that the wrath of Allah *(SWT)* and death both happen suddenly. So, we should be always prepared for that and use whatever worldly riches have been bestowed by Allah *(SWT)* in the way He *(SWT)* wants us to. How many times have we seen the merry shouts of men in pleasure changing into a despondent groan all of a sudden? All these are signs from Allah *(SWT)* for warning us.

The long and short of it is that the life in this world is a trial - a test - and whatever is sown here will be reaped in the Hereafter.

Verse 45

فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ؕ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

"So the people that committed wrong were eliminated. And praise to Allah (SWT), Lord of the worlds."

The verse ordains that the annihilation of unjust people by Allah *(SWT)* is conclusive and certain. Cruelty cannot persist for long. Therefore, as it is mentioned in this verse, when the transgressors are destroyed, Allah *(SWT)* should be praised by the believers.

The verse also hints to the fact that cutting off the roots of mischief and transgression, which means the permanent destruction of such a people who continue committing oppression and sin, is so important that it warrants that the believers ought to praise Allah *(SWT)* and show immense gratitude, while at the same time ask for Allah's

(SWT) forgiveness pertaining to their own shortcomings and always reflect on mending their own ways.

Verse 46

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ؕ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ۝

"Say, "Have you considered: if Allah should take away your hearing and your sight and set a seal upon your hearts, which deity other than Allah could bring them [back] to you?" Look how We diversify the verses; then they [still] turn away."

In this verse, the Qur'an addresses the pagans and questions that if Allah *(SWT)* were to take away His *(SWT)* blessings, such as the senses of hearing and sight, that are the tools for searching real enlightenment of the Truth, as well as the capacity to understand and accept that Truth, and finally set a 'seal on the hearts and rational faculty', thus leaving them unable to discern between right and wrong, and good and evil, then is there any deity, save Allah *(SWT)*, that can return these blessings? The answer is a resounding no!

Although, the pagans of old did believe that the creator and the giver of sustenance is Allah *(SWT)*, but they also worshipped idols as the intercessors and partners with Him *(SWT)*.

The verse continues with that line of argument and tells them to see how Allah *(SWT)* had put forth the same Truth in various verses throughout the Holy Qur'an and had done so in many different contexts and form for them, yet the disbelievers still turn away from the Truth.

Verse 47

قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ۝

"Say, "Have you considered: if the punishment of Allah should come to you unexpectedly or manifestly, will any be destroyed but the wrongdoing people?"

After mentioning in the previous verse three great blessings of Allah, (i.e. eyes, ears, and comprehension/rational faculty), which can be the origin of all blessings in this world and the next, this verse hints to the possible removal of all these blessings in general.

The verse then goes on to declare that the only One *(SWT)* Who *(SWT)* has the authority to punish the evildoers through various forms of chastisement and to take back from them the existing blessings, is Allah *(SWT)*. Thus, idols have no function in this process and so there is no logic in seeking refuge in these false deities.

Moreover, the verse elucidates that the torments which smash those who reject the Truth could be preceded by some signs and warnings, or conversely they might come all of a sudden. In any case, only those who fulfil their covenant with Allah *(SWT)* would remain unharmed.

Verse 48

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝

"And We send not the messengers except as bringers of good tidings and warners. So whoever believes and reforms – there will be no fear concerning them, nor will they grieve."

In this verse, Allah *(SWT)* alludes to the station of His *(SWT)* messengers *(AS)* and tells us that not only can the lifeless idols do anything, but the great prophets *(AS)* also do not have any authority of their own *(AS)*, save whatever Allah *(SWT)* has bestowed upon them *(AS)*. The mission of the messengers *(AS)* of Allah *(SWT)* is to bring to the people glad tidings, warnings, encouragement to do good, and the caution of torment if they do otherwise.

In a nutshell, all blessings that exist in this world and in the Hereafter are from Allah *(SWT)* alone and everything is His *(SWT)* creation that can only come into being with His *(SWT)* command.

The verse then adds that the way to eternal felicity can be found in two things. Firstly, people ought to become sincere believers, and secondly they ought to follow the straight path and keep mending themselves by doing good deeds and avoiding evildoing, while repenting for their sins all the time. For such a people, there will be no fear of punishment or reprisal, nor shall they be made to grieve for any sins that they had committed prior to sincere repentance.

Verse 49

وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝

"But those who deny Our verses – the punishment will touch them for their defiant disobedience."

This verse elucidates the fate of those who do not heed to the warnings from Allah *(SWT)* and His *(SWT)* Messenger *(SAAW)* and states that such disbelievers who reject the Divine revelations will be confronted with the punishment and wrath of Allah *(SWT)* for their mischief and disobedience. This wrath of Allah *(SWT)* may occur in this world and will certainly engulf them in the Hereafter.

Verse 50

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ؕ
قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ؕ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۧ

"Say, [O Muhammad], "I do not tell you that I have the depositories [containing the provision] of Allah or that I know the unseen, nor do I tell you that I am an angel. I only follow what is revealed to me." Say, "Is the blind equivalent to the seeing? Then will you not give thought?"

It would be helpful to start with some philosophical and historical background of the subject at hand before elucidating the verse itself.

Feeble-minded people have always entertained the foolish misconception that the more godly a man is, the more liberated he should be from the limitations of human nature. They expect a godly person to be able to work wonders. By a mere sign of his hand, whole mountains should be transmuted into gold. At his command, the earth should begin to throw up all its hidden treasures. He should have miraculous access to all relevant facts about people. He should be able to point out the locations of things which have been lost, and show how they can be retrieved. He should be able to predict whether or not a patient will survive his disease; whether a pregnant woman will deliver a boy or a girl. Moreover, he should be, above all, free from all human disabilities and limitations.

False conceptions such as these dominated the minds of the contemporaries of the Prophet *(SAAW)*. When they heard of his *(SAAW)* claim to Prophet-hood and Messenger-ship, in order to test his *(SAAW)* veracity they asked him *(SAAW)* regarding things that lie beyond the ken of human perception and to work wonders, and blamed him *(SAAW)* when they saw him *(SAAW)* engaged in such acts as eating and

drinking, and taking care of his *(SAAW)* wife and children, and walking about the markets like other ordinary human beings. The misconceptions such as these that this verse seeks to remove.

The statement of a Prophet *(AS)* in such matters amounts to a testimony based on first-hand observation. For the truths which a Prophet *(AS)* propounds are those which he *(AS)* himself has observed and experienced and which have been brought within the range of his *(AS)* knowledge by means of revelation from Allah *(SWT)*. On the contrary, those who are opposed to the truths propounded by the Prophets *(AS)* are blind since the notions they entertain are based either on guess-work and conjecture or on blind adherence to ideas hallowed by time. Thus the difference between a Prophet *(AS)* and his *(AS)* opponents is as that between a man who has comprehensive vision and a man who is blind. Obviously the former is superior, by dint of this gift of knowledge from Allah *(SWT)* rather than because he has access to hidden treasures, because of his knowledge of the unseen world, and because of his freedom from physical limitations.

This entire verse is a discourse on the absolute rejection of all the distorted notions that the pagans had embedded in their system of understanding regarding who and what a Prophet *(AS)* of Allah *(SWT)* is and what is the real reason for the lofty station of a Prophet *(AS)* of Allah *(SWT)*.

Verse 51

وَ اَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ۝

"And warn by it [i.e., the Qur'an] those who fear that they will be gathered before their Lord – for them besides Him will be no protector and no intercessor – that they might become righteous."

This verse elucidates in detail that those who are too deeply immersed in the allurements of earthly life to think either of death or of their being brought to stand before Allah *(SWT)* for His *(SWT)* judgement can hardly benefit from such admonitions. Even more so, such admonitions can have no wholesome effect on those who cherish the illusion that because of their attachment to some holy personage who will intercede on their behalf, they will come to no harm in the Hereafter. The same

applies to those who believe that someone has already obtained their redemption by expiating their sins. The Prophet *(SAAW)* is therefore told in this verse to pay more attention and to attend to those who are conscious and have little or no false illusions, because such people are more likely to be impacted by admonitions and can be expected to reform themselves and become righteous and accept the Truth.

However, it does not mean that others ought not to be called towards the Truth at all and left to themselves with their false notions, because the Qur'an is Allah's *(SWT)* final message and directed to the entire humankind.

Verse 52

وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ؕ مَا عَلَيْكَ مِنْ حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۝

"And do not send away those who call upon their Lord morning and afternoon, seeking His countenance. Not upon you is anything of their account and not upon them is anything of your account. So were you to send them away, you would [then] be of the wrongdoers."

One of the objections raised by the chiefs and the affluent members of the Quraysh was that the Prophet *(SAAW)* had gathered around him a host of slaves, clients *(mawali)* and others belonging to the lower strata of society. They used to scoff at the fact that men of such humble social standing as Bilal, Ammar, Suhayb and Khabbab *(RA)* had joined his *(SAAW)* ranks. They wondered if they happened to be the only chosen ones of the Quraysh in the sight of Allah *(SWT)*! They not only poked fun at the financial distress of these people but also attacked them for any weakness of character they had before accepting Islam. They went about saying sarcastically that those who had been such and such in the past had now become part of the 'chosen' community.

This verse rejects those objections raised by the chiefs and the affluent members of the Quraysh and declares that everyone is personally responsible for his deeds, whether good or bad. The Prophet *(SAAW)* is told that he *(SAAW)* will neither have to explain to Allah *(SWT)* the

conduct of the converts *(RA)* nor will the latter be required to explain his *(SAAW)* conduct. They can neither usurp his *(SAAW)* good deeds, nor transfer their own misdeeds to his *(SAAW)* account. There is, therefore, no reason for the Prophet *(SAAW)* to alienate those who approach him *(SAAW)* as seekers after the Truth.

Verse 53

وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ؕ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ۝

"And thus We have tried some of them through others that they [i.e., the disbelievers] might say, "Is it these whom Allah has favored among us?" Is not Allah most knowing of those who are grateful?"

The crux of this verse is that by enabling the poor and the indigent, the people who have a low station in society to precede others in believing, Allah *(SWT)* has put those who wax proud of wealth and honour to a severe test.

In other words, the bounty or wrath of Allah *(SWT)* is theirs to gain or lose!

Verse 54

وَ اِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْٓءًا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝

"And when those come to you who believe in Our verses, say, "Peace be upon you". Your Lord has decreed upon Himself mercy: that any of you who does wrong out of ignorance and then repents after that and corrects himself – indeed, He is Forgiving and Merciful."

Several of those who came to believe in the Prophet *(SAAW)* had committed many serious and grave sins before they embraced Islam. Even though their lives had altogether changed following their conversion, the opposition continued to play up the weaknesses and misdeeds of their past life. The Prophet *(SAAW)* is told in this verse to comfort such persons *(RA)* and to tell them that Allah *(SWT)* does not punish those who sincerely repent their sins and mend their ways.

Editor's Note: *Allah (SWT) has bestowed His (SWT) blessing on all of His (SWT) creatures, but He (SWT) has particularly been extra kind to those who surrender and submit to the Will of Allah (SWT).*

By revelation of the words سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ *to the Holy Prophet (SAAW), Allah (SWT) has been extra kind to the Muslims by conveying His salutation to them through the Holy Prophet (SAAW) and telling them that their laxities and shortcomings of their past lives will be pardoned and they will remain safe from all sorts of calamities. He (SWT) has taken upon Himself (SWT) to show mercy.*

Verse 55

وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝

"And thus do We detail the verses, and [thus] the way of the criminals will become evident."

The 'And thus' at the start of this verse refers to the whole of the foregoing discussion, beginning with verse 37 of this Surah ***(Ref: "And they say, "Why has a sign not been sent down to him from his Lord?"...)***. The purpose of this remark is to stress that the persistence of some people in their denial of the Truth and their steadfastness in disbelief and falsehood, in spite of a host of unmistakably clear signs and arguments, was sufficient to prove beyond doubt that they were merely a bunch of thugs, criminals and perennial wrongdoers. If they persisted in error and transgression it was neither through any lack of strong arguments in support of the Truth nor, conversely, because of strong arguments in support of falsehood. The reason was rather that they had deliberately chosen to fall into error and transgression, and the torment prepared by Allah *(SWT)* that awaits them in this world and in the Hereafter, unless they mend their ways, is justified.

==========

And Allah *(SWT)* Knows Best!

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانیٔ تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیان القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

خاص ایڈیشن

- دیدہ زیب ٹائٹل
- امپورٹڈ آفسٹ پیپر
- بڑے سائز میں
- عمدہ طباعت
- مضبوط جلد

سات جلدوں پر مشتمل

مکمل سیٹ کی قیمت: 4400 روپے

عوامی ایڈیشن

- کتابی سائز
- پیپر بیک بائنڈنگ
- امپورٹڈ بک پیپر
- عمدہ طباعت
- دیدہ زیب ٹائٹل

چھ جلدوں پر مشتمل

مکمل سیٹ کی قیمت: 2200 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاہور

K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

Quarterly
Apr.-June 2019

HIKMAT-E-QURAN

Lahore
Vol. 38 No2

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ـــــ اور ـــــ سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمت مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک پیدا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ ـــ اور ـــ غلبۂ دینِ حق کے دور ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ